۲۷۰۶ م

جملہ حقوق محفوظ ہیں

النظر

یعنی

ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی

کی مثنوی "اسرار خودی" پر عالمانہ تنقید

مصنفہ

جناب خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر

مرغوب ایجنسی لاہور کیلئے

صرف سر ورق

کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپا

بار اول   سنہ ۱۹۱۹ء   قیمت فی جلد ۱۲

IQBAL ACADEMY PAKISTAN
26230
LIBRARY
Acc. No.

شکریہ

عالیجناب خاں بہادر مرزا سلطان احمد صاحب
اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی کرمفرمائی کا تہِ دل
سے ادا کیا جاتا ہے کہ انہوں نے بطیب خاطر
الطافِ کریمانہ کو کام فرما کر اپنے اس انظر کے
چھاپ لینے کی اجازت کا ہمیں پورا افتخار
اور ایجنسی کو کامل امتیاز بخشا +

الشاکی
مینجر "مرغوب ایجنسی" لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

المسمّی

النظر

یعنی

جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا لاہور کی مثنوی اسرار خودی پر عالمانہ تنقید

(مصنفہ خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر)

واقف ایں سرِّ الٰہی است کہ خاصاں دانند ۔۔۔ سرِّ لاہوت نہ ہر بندۂ لاہی دانست

فیضانِ قدرت سے حضرتِ انسان کو جو گوناگوں طاقتیں اور بوقلموں قوتیں عطا ہوئی ہیں اُن میں سے بعض ایسی قوتیں اور ایسے جذبات بھی ہیں کہ جن سے انسان کی عظمت بلند نظری اور شرف ثابت ہوتا ہے۔ اور جن کی بدولت وہ اکثر سعادی اور معاشرتی فتوحات کامیابیوں اور دولت کا وارث بنتا ہے۔ اگر کبھی اُن کا استعمال صحیح طور پر نہ ہو یا اُن کی تاویل اور تعبیر میں غلطی ہو جاتے تو اُن جذبات اور قوتوں کی حقیقت رفتہ رفتہ اس قدر مکدر اور مدھم ہو جاتی ہے کہ بجائے نفاد کے اُن سے نقصان پہنچتا ہے۔ اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ انہیں حضرتِ انسان کے شرف اور علو سے کوئی نسبت نہیں۔

جب کبھی کوئی صحیح الدماغ اور معاملہ فہم شخص ابنائے ملت میں سے اُن کی حقیقت پر انفرادی اور اجتماعی رنگ میں روشنی ڈالتا یا حقیقت کے چہرے سے نقاب اُٹھاتا ہے تو بعض لوگ خیال کرتے

ہیں کہ یہ کوئی انوکھا دعوےٰ اور ناموزوں اجتہاد ہے۔

بہ قول حکمائے نفسیات انسان و حیوان میں بعض جذبات اور قوتوں کا اشتراک مسلّم ہے صرف جذبہ (انانیّت۔ خودی اور میں) ہی ایک ایسا شریف اور ممتاز جذبہ ہے جس کی نسبت علمائے موصوف کا یہ دعوےٰ ہے کہ یہ جذبہ صرف انسان ہی کی ذات سے مختص ہے۔ اس جذبہ کا پہلا زینہ یا ابتدائی منزل یہ ہے کہ انسان عملی رنگ میں ایک مستقل ارادہ کے ماتحت یہ سمجھے کہ:۔

"وہ ایک ایسا نفس رکھتا ہے جس پر اُسے اعتماد کرنا چاہیئے۔"

"اُسے ایک احساس اور تعیّنِ ذات حاصل ہے۔"

"وہ ایک شخصیت رکھتا ہے۔"

"اُس کی شخصیت ایک خاص قوّت (خودی۔ خودداری۔ نفس) کے سہارے پر قائم رہ سکتی ہے۔"

"اُس کی شخصیت ایک بڑی قیمت رکھتی ہے۔"

قدرت کی جانب سے یہ تمام قوتیں اور جذبات اُسے انفرادی اور اجتماعی رنگ میں حاصل ہیں۔ بالفاظِ دیگر اس ستّہ ضروریہ کا نام (انانیّت۔ خودی اور میں) ہے جو ہستی ذاتِ خودی اور انانیّت نہیں رکھتی وہ ان زندہ ہستیوں کے ممتاز دائرہ سے خارج ہے۔ جو اس کائنات کے بازار میں کچھ درجہ اور قیمت رکھتی ہیں۔ اور جن کی وجہ سے انسان کو اشرف کہا جاتا ہے۔

(انانیّت۔ خودی اور میں) کیا ہے؟ "حسیات کا اظہار" ضابطہ جو ذاتِ انسان میں قدرت کی جانب سے موجود ہیں۔ حسیات کی تفصیل بہ رنگ استقرائی حسبِ ذیل ہو سکتی ہے:۔

(۱) حسیاتِ وجدانی (۲) حسیاتِ جسمانی (۳) حسیاتِ اخلاقی (۴) حسیاتِ تمدنی۔ (۵) حسیاتِ سیاسی (۶) حسیاتِ انفرادی یا حسیاتِ شخصی (۷) حسیاتِ اجتماعی یا حسیاتِ ملّی۔

انسان علےٰ قدرِ فیضانِ قدرت ان سب حسیات کا مجموعہ ہے۔ ان تمام حسیات کا

دوسرا نام خودی اور خودداری ہے۔ جو انسان خودی اور خودداری نفس قوامہ اور اعتماد نفس سے کام نہیں لیتا یا اس سے نا آشنا اور غافل ہے۔ اُسے زندہ ہستی نہیں کہہ سکتے وہ ایک مُردہ یا ایک بوسیدہ ہستی ہے۔ وہ دُنیا یا اس کشمکش کی سرزمین میں محض اغیار کے سہارے اور دوسروں کی طفیل باقی اور زندہ ہے۔ وہ ایک ایسی بے حقیقت اور بے نمود ہستی ہے جس کا زندہ اور جاندار ہستیوں میں شمار ایک فریب تخیل ہے۔

خودنمائی[1] - خودسازی[2] - خودفہمی[3] - خودضبطی[4] - خودحسابی[5] - خودنگاہی[6] - خودحفاظتی[7] - خودعزتی[8] خودنگری[9] - خودغیرتی[10] - خودطلبی[11] - خوداحساسی[12] - خودی[13] - خودداری[14] اور خودقائمی[15] - ایک صحیح زندگی ہے - یا ان سب عناصر طبعی سے ایک صحیح زندگی وابستہ ہے یا انہی سے زندگی بنتی ہے۔

جو زندگی ان پانزدہ عناصر سے مرکب نہیں وہ زندگی نہیں بلکہ ایک متحرک ڈھانچہ اور مردہ ہستی ایسی زندگی بدقسمتی سے نہ تو کوئی سیرت رکھتی ہے اور نہ کوئی کیرکٹر۔ سیرت اور کیرکٹر کا اعلیٰ عنصر اور غالب جزو خودی اور خودداری ہے۔ سیرت اور کیرکٹر کیا ہے؟ خودی اور خودداری۔ سے

زندگی زندہ دلی کا نام ہے　　　مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

جو انسان یہ پندرہ خودیاں نہیں رکھتا بہتر ہے کہ اس کا نام زندوں میں سے کاٹ دیا جائے۔ اور یہ سمجھا جائے کہ وہ خودکشی کر چکا ہے۔ خودکشی یہی نہیں کہ اپنا گلا کاٹ لیا جائے بلکہ سب سے بڑی اور ذلیل خودکشی یہ ہے کہ قوتوں اور جذبات کا اس طور پر استعمال کیا جائے کہ جو اُن کی اغراض طبعیہ کے منافی ہیں اور اس طریق عمل سے خودی و خودداری مار دی جائے۔ قوموں اور افراد قومی کا زوال جسمانی خودکشیوں سے نہیں ہوتا۔ بلکہ اخلاقی خودکشیوں اور خودی یا خودداری کی خودکشیوں سے ایک ہزار جسمانی خودکشیوں کے مقابلہ میں ایک خودداری کی خودکشی زیادہ تر نقصان رساں ہے۔

ایسا انسان محض کم فہمی اور کفران نعمت سے اُن فضائل جذباتیہ اور ان مکارم طبعیہ کا انکار اور خون کرتا ہے۔ جو قدرت نے نظام عالم کی خاطر انسان کی فطرت میں ودیعت کر رکھے

ہیں۔ کیا ان قوتوں اور جذبات کی قدر و قیمت صرف یہی ہے۔ کہ ہم انہیں اپنی پست ہمتی کی وجہ سے ملیا میٹ کر دیں۔ اور اس عمل شعبہ سے بہت دور جا پڑیں جو ان قوتوں اور ان جذبات کے اظہارِ محاسن کے واسطے ایک ذریعہ ہے۔ پست فطرتی کا نام ہم اپنے بزدلانہ الفاظ میں۔ بُردباری۔ تحمل۔ استقامت۔ درگذر۔ انکسار۔ فروتنی۔ نفس کشی۔ تنفر از دنیا۔ دینداری رکھتے ہیں۔ یہ عمل ہمارا اُس ضابطہ قدرت اور اقتضائے فطرتِ صحیحہ کے منافی ہے جو ہمیں حاصل ہے۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہمیں ایک نعمت یا ایک قوتِ نفس حاصل ہے۔ کیسا نفس؟ جو سب نفوس سے ارفع اور اعلےٰ ہے۔ جو ہماری حقیقت اور ہماری اصلیت ہے اور دوسرے الفاظ میں جس کا نام انسان اور انسانیت اور صحیح زندگی ہے۔

ہمارے جسم میں جسقدر اعضاء اور قوتیں ہیں ان سب کا ہم پر کچھ نہ کچھ حق ہے۔ نفس کے بھی حقوق ہیں۔ اگر ہم نفس کے حقوق سے چشم پوشی کرینگے یا اُس سے وہ کام لینگے جس کا وہ اہل نہیں تو ہم منشائے قدرت کے خلاف جائینگے۔

"گر حفظِ مراتب نکنی زندیقی!"

جب ہم خودی یا نفس کی غلط معنوں میں تاویل کرتے ہیں۔ تو گویا خودی اور نفس کی حقیقت کو چھپاتے اور بے حقیقت قرار دیتے ہیں۔ نفس کی موٹی موٹی تین قسمیں ہیں۔

(الف) نفس امّارہ (ب) نفس لوّامہ (ج) نفس مطمئنہ۔

نفسِ امّارہ سے مراد وہ نفس ہے۔ جو سرکش اور متمرّد ہو دوسرے الفاظ میں رعونت اور تکبر۔ نفس لوّامہ سے وہ نفس مراد ہے۔ جو اپنی کمزوریوں معاصی غلط کاریوں کا معترف ہو کر اصلاح اور ندامت کا محرک رہتا ہے۔ نفس مطمئنہ وہ نفس ہے۔ جو صفات ذمیمہ سے نکلکر صفات حمیدہ اختیار کرتا ہے۔ نفس مطمئنہ اور نفس لوّامہ ایک خودی اور خودداری ہے۔ کیونکہ خوددار وہی ہوتا ہے۔ جو اپنی کمزوریوں اور غلطیوں پر آگاہ ہو کر باعترافِ قلبی ایک ندامت کے ساتھ

صفات حمیدہ کی طرف رجوع لائے۔ اور اُن پر ثابت قدم رہے۔ خودی اور خودداری کا یہ مفہوم نہیں کہ طالبِ رذائل ہو کر اپنی ہستی کی وقعت اور احترام کھو بیٹھے۔ خودی اور خودداری کے معنے اپنی حفاظت بمعنیٰ اور پوزیشن قائم رکھنے کے ہیں۔ خودی کیلئے استحقاق خود حفاظت یا خود کا بالمقابل قائم رکھنا جس سے پوزیشن درجہ شرافت کرامت ماتحت اصول تنازع للبقاء عقابات آدمیت باقی ہے۔ بیشک خودی بمعنے رعونت اور تکبّر کے بھی آتی ہے۔ جو ہر حالت میں مذموم اور معیوب ہے۔ جس طرح نفس ایک ہی ہے۔ اور اُسکی اعتباری کیفیات تین ہیں۔ اسی طرح خودی اور خودداری بھی مختلف درجے رکھتی ہے۔ اور یونہی کیوں نہ کہا جائے کہ خودی سے مراد ہی نفس قوامہ اور کیفیات نفس صحیحہ ہیں یا یہ کہ اس پر قادر ہونا۔ اُن کو صحیح معنوں میں زندہ رکھنا ایک خودی اور خودداری ہے۔ جب خودی رعونت اور تکبّر کے رنگ میں ہوتی ہے۔ تو وہ انسان کے ذلیل ترین افعال سے تعبیر پاتی ہے۔ جب اپنے آپ پر قادر ہو کر اپنی نمود قائم رکھتی ہے۔ تو اُس کا نام نفس لوامہ۔ نفس مطمئنہ۔ نفس قوامہ خودی۔ خودداری۔ خود سازی۔ خود نگیری اور خود احتسابی ہو جاتا ہے۔

حضرت اقبال مثنوی اسرارِ خودی میں اُس خودی کی یاد دلاتے ہیں جو نفس قوامہ نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ یا خودداری کے معنوں اور رنگ میں ہے۔ اس خودی اور اس خودداری کا اپنے رنگ میں قرآن بھی معترف ہے۔ جیسے کہ ارشاد ہوتا ہے۔

"لَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ"

"يٰأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً"

دیکھو کن شاندار الفاظ میں خودی اور خودداری کا اعتراف کیا گیا ہے۔ خودی اور خودداری کے قرآنی رنگ میں تین پہلو ہیں:۔

۱۔ صیانت من الرذائل۔

۲۔ تحرک اخذِ فضائل۔

۳- تحرک استقامت- غیرت- خودسازی- خودانگاری، جوخودی- خودداری ان کیفیات اور مقتضیات سے خالی ہوگی- وہی نفس امّارہ رعونت اور تکبّر کے معنوں میں لی جادیگی- اور وہی حضرت اقبال کی بحث اور مثنوی سے خارج ہے-

حضرت اقبال مثنوی اسرار خودی میں اُس خودی کا ذکر کرتے ہیں- جو ہر مومن اور مسلم کا فخر اور مایۂ ناز ہے- مومن اور مسلم وہ نہیں جو چند ظاہری شعائر اسلام سے، واقف اور انکا عامل ہے- بلکہ مومن اور مسلم سے وہ شخص مراد ہے جس کا ایمان ہر پہلو سے صادق اور مضبوط ہو جسے کوئی بات بھی اپنے ارادہ خیال اور پایہ سے ہلا نہ سکے- ساری دُنیا ایک طرف ہو اور اُسکا ایمان اور اسلام ایک طرف نجات اُن ہی کے واسطے ہے- جو ایمان میں مضبوط اور استوار ہیں ایمان اُن ہی کا مضبوط ہے- جو ایمانی رنگ میں خوددار اور خودضابطہ ہیں بمصداق نص قرآنی:- اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وہی لوگ خالص اور مکمل مسلمان ہیں- جو ذوق ایمانی رکھتے ہیں- ذوق ایمانی کا پہلا زینہ خودی اور خودداری ہے-

ایسے ہی لوگ ہیں جنہیں قرآن مجید میں مومنوں کے نام سے یاد کیا گیا ہے- ایسے ہی لوگوں کی نسبت کہا گیا ہے- کہ اُنہیں کوئی خوف نہیں- ہماری فطرت اور ہماری فطرت کے صحیح مقتضیات چونکہ سب فطرتوں اور سب فطرتوں کے مقتضیات سے اعلےٰ اور ہمارے جذبات تمام جذبات سے ارفع واقعہ ہوئے ہیں- اسواسطے ہمیں خودی اور خودداری کے رنگ میں نفس قدّامہ نفس لوّامہ اور نفس مطمئنہ حاصل ہے- یہ صرف غلطی اور فریب تخیل ہے- کہ ہم ان جذبات خودی اور خودداری کو مکروہ اور پست فطرت خیال کرتے ہیں- یہ قرآنی تعلیم کے خلاف اور روشِ محمدی کے منافی نہیں ہے- پیارے احمد اور قرآن نے یہی سکھلایا ہے- ؎

زفیض صبح مشو غافل اے سیاہ دروں   صفائے ایں نفس بے غبار را دریاب

جو لوگ واقعاتِ عالم کا احساس رکھتے یا کرتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں- کہ جو شخصیتیں جو قومیں فلسفۂ اعتماد نفس- فلسفۂ خودی، فلسفۂ خودداری، فلسفۂ خودسازی، فلسفۂ وقار و عزت

فلسفہ حمیت و غیرت فلسفۂ عمل سے عاری اور خالی ہیں۔ وہ رفتہ رفتہ زمانہ کی شاہراہ یا صراطِ مستقیم سے دُور ہٹائی جا رہی ہیں۔ زمانہ زور سے منادی کر رہا ہے کہ :-

دُنیا میں صرف وہی لوگ اور وہی قومیں زندہ رہنے کے قابل ہیں۔ جو یہ اصول تنازع للبقاء اپنی مدد کرتی اور اپنا حساب خود لیتی ہیں۔ اور جن میں خودی اور خودداری اور نفس قوامہ کام کر رہا ہے۔ ہر انسان کا انفرادی اور اجتماعی رنگ میں یہ فرض ہے کہ وہ یہ سمجھے یا ایسا سمجھنے کی کوشش کرے کہ :-

"وہ کس ماحول میں رہتا ہے"

"اُسے اُس ماحول سے کیسی نسبت ہے"

"اُس کا اُس ماحول میں پایہ کیا ہے"

"اُس کا پایہ مقابلتاً کیسا ہونا چاہیے"

"وہ جس مقام پر کھڑا ہے اُس کا اقتضاء کیا ہے"

"وہ جس دُنیا میں رہتا ہے۔ وہ کیا رنگ رکھتی ہے"

"اُس کی حدود امتیازی کیا ہیں۔ اور کیا کچھ وسعت رکھتی ہیں"

یہ سب باتیں جذبۂ خودی اور خودداری کی عملی تفسیر ہیں۔ انہیں سمجھ وہی سکتا ہے جسے فلسفۂ خودی اور خودداری اور فلسفۂ خود سازی سے واقفیت ہو۔ یہ فلسفۂ خودی اور خودداری محض پڑھنے اور تعلیم ہی سے نہیں آتا۔ بلکہ سمجھنے سے بڑے بڑے تعلیم یافتہ بھی بعض وقت جذبۂ خودی اور عملی خودداری سے محروم نظر آتے ہیں۔ اور خلاف اُن کے ایک عامی اور کمزور دماغ کا آدمی عملی رنگ میں خودی اور خودداری سے متاثر ہوتا ہے۔ عامیانہ الفاظ میں خودی اور خودداری کا نام غیرت۔ حیا اور شرم بھی ہے۔ دُنیا میں بہت سی ایسی مثالیں ملیں گی جن سے یہ ثابت ہوگا کہ :-

بعض اوقات ایک عام آدمی بھی غیرت اور شرم کے جوش میں وہ کام کر دکھاتا ہے۔

جو بڑے بڑے لوگوں سے بھی نہیں ہو سکتا۔ ثابت قدمی بھی خودی اور خودداری ہے۔ خودی اور خودداری ایک ہمت، شجاعت اور مردانگی ہے۔ اور اس کا ناجائز طریق سے مار دینا ایک نامردی۔ ؎

تا سر نہ دہم پا نکشم از سر کوئیش
نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد

خودی اور خودداری سے کیا مراد ہے

علم النفس ایک ایسا علم ہے۔ جسپر زمانہ کے حکمائے نامدار اور فلاسفران باوقار نے بہت کچھ کہا سنا ہے۔ یہ وہی علم ہے۔ جو ہر ایک شخص کی خود اپنی ہی ذات سے شروع ہوتا اور ترتیب پاتا ہے۔ جو شخص ایک ماہر علم النفس کی مدقق کتاب سبقاً سبقاً پڑھتا ہے۔ اور جسے ایک مشکل کتاب سمجھتا ہے۔ اس میں خود اسی کی ذات اور اسی کی قوتوں اور جذبات کا بیان ہوتا ہے۔ خودی اور خودداری بھی علم النفس کی ایک لازمی اور دلچسپ شاخ ہے۔ خودی اور خودداری کیا ہے؟

"وہ احساس جو انسان کو ہستی کے اس اعلےٰ پایہ پر قائم رہنے کی عملی تحریک کرتا ہے۔ جو ہر ایک انسان کی شخصیت اور قومیت کیواسطے اپنے کردار یا اپنے ماحول میں رہکر ایک لازمی پایہ ہے۔"

"وہ محرکات جو شخصی اور قومی زندگی کو بہ حیثیت ایک زندگی کے باصول تنازع للبقا قائم رکھتے یا رکھ سکتے ہیں"

"وہ کیفیات جو ایک زندگی کو ایک صحیح زندگی کے رنگ میں نشوونما بخشتی ہیں"

"وہ جذباتی تاثرات جو عملی رنگ میں ایک وقار اور احترام کے ساتھ دوسروں پر اثر کرتے اور خود متاثر ہوتے ہیں"

"وہ ضمیری استقلال جو بحیثیت ایک ضمیری شان اور وقار کے دنیاوی و دینی مراحل میں بلا تزلزل محرک شارع و خاتم اعمال ہوتا ہے۔"

"وہ عقل و فراست جو ایک مستقل اور مستقیم پیمانہ سے دنیا میں کام کرنے کی محرک اور عادی ہے۔"

"وہ حوصلہ وہ بردباری وہ تحمل جو ایک شخصیت اور ایک قومیت کو وقار کے رنگ میں علم و

عالمیان کے سامنے پیش کرتا ہے۔

"وہ غیر متزلزل استقلال وہ صادق عزم جو تمام مایوسیوں - ہر مصیبتوں اور افکار کا مقابلہ کرنے میں ایک بے نظیر اور عدیم المثیل ہستی یا قوت شمار ہوتی ہے۔

رسول عربی (روحی فداہ) فرماتے ہیں۔

"علیکم باتقاء الله وحده لا شریك له والوقار و السکینة

(ترجمہ) تمہیں صرف اکیلے اللہ کا ڈر رکھنا چاہیے۔ اسکا کوئی ساجھی نہیں۔ اور وقار تحمل و اطمینان سے رہنا چاہیے"

اس حدیث کے جامع و مانع الفاظ پر غور کرو۔ صرف اللہ پر بھروسہ رکھنا۔ اور اُسی سے ڈرنا یعنی اُسی پر عاملانہ توکل کرنا۔ اور تحمل و اطمینان سے رہنا ایک موقرانہ سلامتی ہے۔

اس حدیث شریف میں الفاظ تحمل اور اطمینان اپنے اندر ایک جامعیت رکھتے ہیں حضرت اقبال اس مثنوی میں جس خودی کے اسرار پر بحث کر رہے ہیں۔ وہ تحمل اور اطمینان ہی تو ہے۔ جو شخص خودی قائم رکھتا اور خوددار ہوتا ہے وہ ایک تحمل رکھتا ہے۔ اور جو شخص متحمل ہوتا ہے وہ اطمینان سے رہتا ہے۔ گویا اطمینان یا طمانیت اسی حالت میں مل سکتی ہے جب انسان خودی رکھے اور خوددار ہو۔ اس کے سوا یہ طمانیت ملتی ہی نہیں۔ یہ ایمان کیا ہے؟ ایک طمانیت جس ایمان میں طمانیت اور استقامت نہیں وہ ایمان نہیں۔ ایمان بھی خودی ہی کا ایک کرشمہ ہے۔ کیا یہ قیاس میں آسکتا ہے۔ کہ جس شخص میں خودی نہیں یا جو خوددار نہیں وہ ایمان دار ہے؟ جن لوگوں کو قرآن مجید میں مسلمین اور مومنین کے نام سے مخاطب کیا گیا ہے۔ اُن سے وہی لوگ مراد ہیں جو اسلامی اور ایمانی رنگ میں خوددار ہیں۔ جیسے ایمان صدہا صعوبتوں اور آزمائشوں پر بھی متزلزل نہیں ہوتا ایسے ہی خودی اور خودداری بھی متزلزل نہیں ہوتی جس طرح پختہ اور صادق ایمان محاسنِ دینی کا وارث بناتا ہے۔ اسی طرح خودی اور خودداری معاد اور معاشرت دونوں میں شرف بخشتی ہے۔

صوفیائے کرام کہتے ہیں۔ قلب المؤمن عرش اللہ

اِس کا مطلب یہ نہیں کہ مومن کے قلب پر اللہ تعالےٰ متمکن ہے یا نعوذ باللہ وہ اُس کا عرش ہے۔ بلکہ یہ کہ اللہ تعالےٰ نے قلبِ مومن کو اس قسم کا احترام و وقار اور تمکنت بخشی ہے کہ وہ مجازی رنگ میں عرش اللہ ہے۔ جس ضمیرِ عرش اللہ میں خودی اور خودداری نہ ہو وہ عرش اللہ کب ہو سکتا ہے۔ خودی کو مارنا عرش اللہ کو گرانا یا ڈھا دینا ہے۔ خودی قائم رکھنا عرش اللہ کو قائم رکھنا اور اُن برکاتِ عظیمہ سے مستفید ہونا ہے جو خودی کی بدولت حاصل ہو سکتی ہیں۔

ایک فقرہ زبان زدِ عام ہے۔

"دل بدست آور کہ حج اکبر است"

لوگوں نے اِس کے مختلف معنے لئے ہیں۔ میری رائے میں اس کا قریبی مفہوم یہی ہو سکتا ہے کہ اپنے دل کی ماہیت اور کیفیت سے واقف ہو جانا گویا ایک کارِ نمایاں ہے۔ دل کا ہاتھ میں لانا کیا ہے؟ اُسے اُس کی اصلی عظمت پر قائم رکھنا اُس کی حقیقی عظمت اور وقار کا سمجھنا۔ وہ اصلی عظمت کیا ہے؟ "خودی اور خودداری"۔

فلسفۂ خودی کے سمجھنے کے واسطے سوچنا چاہئے کہ کیا قدرت نے ہماری فطرت اور سرشت اور ہمارے جذبات کو ناشائستہ اور پست بنایا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہم خود ہی دے سکتے ہیں۔ ہر شخص اپنے اندرونہ پر غور کر کے کہہ سکتا ہے کہ کیا اُس کی فطرت پست اور ذلیل بنائی گئی ہے یا وہ خود کو ذلیل سمجھتا ہے۔ اور کیا وہ پستی اور ذلت کا مرجع اور مصدر ہے؟ نہیں نہیں!! ہمیں کہا گیا ہے۔ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ گویہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم عجلت پسند ہیں لیکن باوجود اِس کے بھی ہماری فطرت سب فطرتوں اور ہمارے جذبات سب جذبات سے اعلیٰ اور ارفع بنائے گئے ہیں۔ ہم حیوانِ ناطق ہیں۔ بشرفِ نطق ہی میں ایک فضیلت اور عظمت ہے۔ اور نطقِ کامل ہی خودداری کا پہلا زینہ ہے۔

ہماری نسبت ہی کہا گیا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ

گو اس قول کے یہ معنے نہیں کہ سچ مچ خدا کی صورت پر ہی ہماری خلقت ہوئی ہے۔ کیونکہ خدا تو شکل و شباہت سے منزّہ اور پاک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں خدا نے اور مخلوقات کے مقابلہ میں ایک خصوصیت دے رکھی ہے۔ وہ خصوصیت کیا ہے؟ ہمارا علو اور ہماری بلند خیالی یا بلند پروازی یہ علو۔ بلند خیالی اور بلند پروازی کیا ہے؟ وہی خودی اور وہی خودداری جس کا وعظ حضرت اقبال نے شروع کیا ہے۔ ؎

در جہاں ہر فتح از کرداری است
آبروئے مرد از خودداری است

عورتوں کی عفت و عصمت پاکدامنی۔ پاکیزگی حیا و شرم۔ مردوں کی یہ شجاعت۔ یہ تہور۔ یہ مردانگی یہ بہادری کیا ہے خودی اور خودداری ہی کا تماشا تو ہے۔ شجیع و متہور میدان میں دیکھتا ہے کہ دشمن قوی ہے پھر بھی مرد میدان بنکر کھڑا رہتا ہے زخم کھاتا ہے۔ مگر اف نہیں کرتا۔ ایک پاک دامن عورت باوجود انواع و اقسام کی تحریکات کے بھی دامن عصمت پر دھبہ نہیں لگنے دیتی یہ خودداری ہی تو ہے۔ خودداری دو لفظوں سے مرکب ہے۔

(الف) خود (ب) دار سے۔

اپنے تئیں ہر صعوبت ہر مصیبت ہر امتحان اور ہر آزمائش میں قائم رکھنا غیرت اور حمیت ہاتھ سے نہ دینا۔ اللہ پر بھروسہ رکھنا ہر رنگ میں عصمت عظمت وقار اکرام و احترام کا خواہشمند رہنا اور اس کی لے میں ہی لگاتار چلے جانا اور اس انہماک سے نہ گھبرانا شخصی اور قومی رنگ میں ایک خودداری ہے۔ خودی اور خودداری میں تکلیفات اور نقصانات بھی اٹھانے پڑتے ہیں۔ ان سے ڈر کر رشتہ خطی ہو جانا خود کو بزدل ثابت کرنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں خودی کا مفہوم مقابلہ تکالیف اور مصائب بھی ہے۔ تحمل بردباری اور اس کے ساتھ استقامت و طمانیت ایک مخصوص خودی ہے۔

خوف را در سینۂ او راہ نیست
خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست

قرآن مجید میں ہمیں کہا گیا ہے۔ اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ
صبر بھی ایک قسم کی خودی اور خودداری ہے انسان پر صد ہا صعوبتیں زندگی میں آتی ہیں صابر کا ان کا

مقابلہ کرنا ایک صادق خودداری ہے۔ صبر کے ساتھ لفظ صلوٰۃ ایک عجیب کیفیت رکھتا ہے۔ صلوٰۃ کے معنے دعا اور رحمت کے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے مصائب اور امتحانات میں صبر کرو اور دعا میں مشغول رہ کر رحمت کے خواستگار ہو یعنی اور سب بزدلیوں، لجاجتوں اور چاپلوسیوں سے الگ ہو کر صرف اللہ ہی کی درگاہ میں مستدعی ہو۔ دیکھو کس رنگ میں خودی اور خودداری کی تعلیم دی گئی ہے۔
قرآن مجید میں کہا گیا ہے وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ

"اسلام ہی پر تم کو مرنا چاہیے"۔ اسلام میں نری نماز، روزہ، زکوٰۃ ہی شامل نہیں۔ کیونکہ خود قرآن ہی کہتا ہے لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ الخ

اسلام میں عبادات اور معاملات دونوں شامل ہیں۔ دیکھو اس آیت میں کس جامعیت سے خودی اور خودداری کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ ارشاد ہوتا ہے۔ چاہے کیسا ہی تم پر ضبط اور تنگی ہو اور کیسی ہی آزمائش میں تم گھر جاؤ پھر بھی تمہیں اپنی وضع نباہنی چاہئے اپنا حوصلہ نہیں ہارنا چاہئے۔ دیکھو کس خوبصورتی سے شخصیت اور ذہنیت کی خوبیوں اور ضروریات کی حفاظت کی تعلیم دی گئی ہے۔ اگر ہم دل لگا کر قرآن پڑھیں تو ہمیں ثابت ہو جائیگا۔ قرآن کس جامعیت اور کس وسعت سے خودی اور خودداری کی تعلیم دے رہا ہے۔ قرآن بڑا ہی خوددار ہے۔ وہ دعوے سے کہتا ہے کہ میری خودداری میں کبھی فرق نہیں آسکتا۔ میری خودداری کا بمنشائے وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ خدا خود محافظ ہے۔ جب تک خدا کی خودی ہے تب تک میری خودداری بھی ہے۔ چونکہ قرآن خوددار ہے۔ اس واسطے وہ اپنے پرستاروں اور قارئین کو بھی خودداری سکھاتا ہے اور خودی کی برکات سے آگاہ کرتا ہے۔ بمنشائے وَادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً جب تک ہم میں خودی کا جوہر نہ ہو جب تک ہم خوددار نہ ہوں تب تک ہم مسلمان ہو ہی نہیں سکتے۔ خودی خودداری کھو دینا اسلام کھو دینا ہے۔ خودی اور خودداری اسلام ہے اور اسلام خودی اور خودداری ہے۔ ؎

علم مسلم کامل از سوز دل است — معنئ اسلام ترک آفل است

مسلمان کیوں پست ہو گئے

ایں سیلِ سرشک از کجا خاست   چُل در دلم ایں قدر نبود است

اب کچھ کچھ مسلمان خوش قسمتی سے غور کرنے لگے ہیں کہ ہم

"اقبالی مراحل سے کیوں دُور جا پڑے"۔

"اقبال ہم سے کیوں دُور ہٹ گیا"

"اقبال کی نگاہوں سے ہم کیوں گر گئے"۔

"اقبال ہمیں کیوں چھوڑ گیا"

"ہمارا اقبال ادبار سے کیوں بدل گیا"

اِن سوالات کے بہت سے جوابات ہو سکتے ہیں۔ بہ مصداقِ "فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست" اپنے اپنے رنگ میں ہر شخص جواب دے سکتا ہے لیکن خدا لگتی یہ بات ہے کہ مثنوی اسرارِ خودی میں حضرت اقبال نے جو جواب دیا ہے۔ جو نقص بتایا ہے۔ اصل اور شافی جواب وہی ہے قرآن نے بھی پیشینگوئی کے رنگ میں یہی جواب دیا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

سوچو کہ یہ حبل اللہ کیا ہے اور تفرقہ کا اثر کیا کچھ ہوتا ہے۔

حبل اللہ کوئی مونجھ اور سنی کی رسی یا لوہے کی زنجیری نہیں کوئی سوتی طناب نہیں حبل اللہ سے مراد قرآن اور قرآنی تعلیم ہے۔ حبل اللہ سے مراد محمدؐ ہے حبل اللہ سے مراد اسلام ہے۔ حبل اللہ سے مراد ایمان ہے۔ اور ان سب سے مراد تمسک کامل تاخذ واثق عملی قوت عملی تاثر ہے۔ اور ان سے مراد خودی اور خودداری۔ خودی اور خودداری میں نہ غیر مشروط کشادہ دلی نہ غیر مقید کشادہ مزاجی جو شرب مسلم کے منافی ہو۔ ایک سخت غلطی اور نا قابلِ معافی عمل اور جرم ہے۔ مسلمانوں نے ناجائز و نقصان دہ کشادہ دلی۔ کشادہ منشی سے اپنی خودی اور خودداری کا خون کر دیا۔ جس قوم میں اِس قسم کی

قابل نفرت کشادہ دلی پائی جاتی ہے۔ وہ دوسری قوموں میں جلد تر جذب ہو جاتی یا جلد تر جذب ہونے کی طبیعت پیدا کر لیتی ہے۔ دُنیا میں وہی قوم قائم اور باقی رہ سکتی ہے جو دوسری طاقتوں دوسری قوتوں دوسرے افراد کو خود تو جذب کر لے۔ لیکن آپ اُن میں جذب نہ ہو۔ قرآن مجید میں اسی طاقت کے قائم رکھنے کے واسطے کہا گیا ہے۔

اُدْعُ اِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّکَ "تَعَالَوْا اِلیٰ کَلِمَۃٍ وَّاحِدَۃٍ"۔

"کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْہَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ"

دیکھو ان آیات کریمہ میں کس جامعیت اور کس خوبصورتی سے یہ حکم دیا گیا ہے۔ کہ تم تو کسی میں جذب نہ ہو۔ ہاں دوسروں کو جذب کر جاؤ۔ تم پیدا ہی اس واسطے کئے گئے ہو کہ دوسروں کو خود میں جذب کر لو۔ یہ بات کب پوری ہو سکتی ہے جب ہم خودی رکھیں اور خوددار ہوں۔ اگر ہم خودی نہیں رکھتے۔ یا ہم خوددار نہیں تو یہ خدمات بھی ہم سے ادا نہیں ہو سکتیں یہی بدبختی اور یہی کمی ہے جو ہمیں کھا گئی یہی نحوست ہے جو ہمیں شاہ اقبال کی محترمانہ نگاہوں سے ذلت کے ساتھ گرا چکی۔ یہی نامرادی ہے جو ہم سے ہمارے پیارے اقبال و احترام کو بُری طرح بدظن کر چکی ہم دُنیا کی نگاہوں میں ذلیل و خوار ہو چکے ہم اپنی جذباتی طاقتیں کھو چکے۔ ہماری نفرت خیز کشادہ دلی نے ہمیں مار دیا۔ ہمارے مذبذب الایمان ہونے اور ہرجائی پن نے ہمیں ذلیل کر دیا۔ ہم جادۂ اسلاف اور مسلک آبائی سے دُور جا پڑے۔ مگر نہ سمجھے۔ ؎

دل ہمی نالد ز عشق بیزاری نمے داند کہ چیست
بارہا جان من از زاری بہ لب آمد و لے

جب تک ہم میں جذبہ خودی اور خودداری نہ ہو تب تک ہم یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ ہم دُنیا اور اس ماحول میں قائم کس طرح رہ سکتے ہیں۔ اور ہماری زندگی محترم زندگی کس طرح ہو سکتی ہے خودی اور خودداری ایک محترم حِس ہے۔ جس ایک زندگی ہے جو حس ہم میں نہیں رہی۔ اس واسطے ہم اس وقت مُردہ ہیں۔ زندہ نہیں حضرت اقبال نے مثنوی اسرار خودی میں اس حس کے زندہ کرنے کے واسطے ایک عملی مضمون پڑھا ہے۔ خدا کرے اس میں تاثیر اور تحریک کی رُوح پیدا ہو۔ خدا کرے

اُس کے ذریعہ سے ہماری مردہ رُوحیں بے حس زندگیاں اخلاقی قوتیں رفتہ رفتہ حرکت میں آئیں اور ہمارے لئے یہ مثنوی ایک اعجازی رنگ رکھے۔ خُدا کرے ہم میں خودی خودداری اور نفس قوامہ کام کرے نفس قوامہ میں پھر وہ رُوح پیدا ہو جو ہمارے اسلاف میں کام کرتی تھی۔ جذبات میں وہ تحریک پیدا ہو جو قرآنی تعلیمات کا منشا ہے۔ اخلاق اور مراسم تمدنی میں وہ جدت وہ سعادت وہ ضبط وہ استواری وہ صداقت وہ مستحکمیت پیدا ہو جو ترقی یافتہ قوموں کا خاصہ ہیں۔ اور ہم سلامت روی سے سمجھنے لگ جائیں کہ توحید کا اعلےٰ مدعا خودی اور خودداری کا قائم رکھنا ہی ہے اور یہی اسلام کی ممتاز تعلیم ہے

غافل از حفظ خودی یکدم مشو ریزۂ الماس شو شبنم مشو

اس شعر میں حضرت اقبال نے زندگی کا جو فلسفہ بیان کیا ہے۔ وُہ دُنیا کے تمام فلسفوں کا اخلاقی اور تمدنی رنگ میں سرتاج اور سرآمد ہے۔ حضرت اقبال فرماتے ہیں۔

ہمیں اِس دُنیا میں شبنم بن کر نہیں رہنا چاہیئے۔ شبنم رات کو گرتی ہے۔ اور صبح ہی حدتِ آفتاب سے اُڑ جاتی ہے۔ شبنم کی یہ نزاکت یہ لطافت اور سریع الانفعالی ثابت کر رہی ہے کہ شبنم کی زندگی اور ہستی کسقدر زود اور طافت رکھتی ہے۔ بیشک شبنم کے قطرات خوبصورت اور لطیف ہوتے ہیں۔ بے شک بعض شاعروں نے انہیں موتیوں سے بھی نسبت دی ہے۔ لیکن اُس کی یہ لطافت یہ خوبصورتی کوئی پائداری نہیں رکھتی۔ باوجودیکہ ساری رات گرتی ہے صبح ہوتے ہی اپنی ہستی کھو بیٹھتی ہے۔ حدت آفتاب کے سامنے دم بھر بھی ٹھہر نہیں سکتی جو ہستی شبنم نما ہے۔ وہ دُنیا کی تکلیفات اور سرد و گرم کا مقابلہ کس طرح کر سکتی ہے۔ اور اُس کا کیریکٹر کس طرح مضبوط اور اعلےٰ کہا جا سکتا ہے۔ اُس کا حشر وہی ہوتا ہے۔ جو شبنم کا ہوتا ہے۔ دن چڑھا اور اُڑ گئی۔ کیا کوئی شخصیت اور کوئی قوم جو شبنم نما ہستی رکھتی ہے۔ وہ اِس قابل ہے کہ شخصیت اور قوم کہلائے وہی شخصیت اور وہی قوم اس ماحول میں آبرو کے ساتھ رہ سکتی ہے۔ اور اس بادنما ہستی میں اُسی کی قیمت پڑتی ہے۔ جو قومیت میں استوار مضبوط۔ قائم بذاتہ اور مستحکم ہو۔ ریزہ الماس حدت آفتاب

سے دھوپ میں چمکتا ہے۔ وہ آفتاب کے ساتھ ایک حد تک مقابلہ کرتا ہے۔ گو اُس کی چمک اور اُس کی بھڑک اُسی کا عکس ہوتی ہے لیکن پھر بھی وہ یہ دعوے کرتا ہے۔ کہ میں بھی کچھ ہوں یہ دعوے اُس کی قیمت اور اُس کی مانگ دو بالا کر دیتا ہے۔

وہ اُن ذرات سے مرکب ہے۔ جو شبنم کی طرح اُڑا نہیں جاتے ایسے ذرات زمانہ کی سردی و گرمی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ یہ دعوے کرتے ہیں۔ کہ ہم بھی اِس دُنیا میں اپنی حدود کے اندر رہنے کا حق رکھتے ہیں۔ اور ہماری بھی کوئی پوزیشن ہے۔ وہ ہوا اور دُھوپ میں جذب ہونا پسند نہیں کرتے اُن میں شبنم کی طرح کشادہ دلی اور انفعال نہیں ہے۔ وہ اگر ایک طرف متاثر ہوتے ہیں۔ تو دوسری طرف مؤثر بھی ہوتے ہیں۔ اِس روشن مثال سے خودی اور خودداری کی قیمت اور خوبی کا اعتراف ہو سکتا ہے۔ کیا تم اِس دُنیا میں شبنم بنکر رہنا چاہتے ہو یا ریزۂ الماس؟

اب تم خود یہ فیصلہ کر لو کہ تم کس حیثیت سے رہنا چاہتے ہو اگر شبنمی حیثیت مرغوب خاطر ہے۔ تو تم چند منٹوں ہی کے مہمان ہو۔ اور تمہاری قیمت کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ زمانہ کی تھوڑی سی حدت بھی تمہیں ہمیشہ کے لئے بے نام و نشان کر دیگی۔ اگر تمہیں اپنی ہستی کی پائیداری کا خیال ہے تو ریزہ الماس بنو۔ گراں بکو اور گراں ہو کر رہو۔ ارزاں ہونا اپنی ہستی کھوتا ہے "ہر چہ باشی باش الا گراں باش"۔ اس کے ساتھ ہی تمہیں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ:۔

تمہاری فطرت تمہیں کیا کہتی اور کیا سکھاتی ہے۔ اگر فطرت یہ کہتی ہے کہ بیلے کی زندگی رکھتے ہوئے شبنم کی طرح ہستی کھو بیٹھو۔ تو یہ دوسری بات ہے لیکن اگر تمہاری فطرت تمہیں اُسی قسم کی استواری کا سبق اور پیغام دیتی ہے۔ جو الماس رکھتا ہے تو تم خود ہی سمجھ سکتے ہو۔ کہ تمہاری پیدائش سے قدرت کا اِس دُنیا میں اصل منشا کیا ہے۔ بیشک ہم فانی ہیں لیکن اِس کا یہ مطلب تو نہیں کہ خود اپنے ہی ہاتھوں فنا ہو جائیں۔ یہ تو ایک بزدلانہ خودکشی ہے۔ اور اِس بزدلانہ خودکشی پر یہ سوال ہوگا۔ "بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ"

جو شخصیت جو تم خودی کھوتی اور خودداری سے دُور جا پڑتی ہے۔ وہ خودکشی کرتی ہے۔

وہ ان نعمائے ربانی سے مُنہ پھیرتی ہے۔ جو ہمیں حاصل ہیں۔ وہ اُن قوتوں اور اُن جذبات کا خون کرتی ہے۔ جو ہماری فطرت میں بہ مختلف مقادیر موجود ہیں۔ اور جو ہمارے شرف و اکرام کا باعث ہیں۔ اور جن کی وجہ سے ہم انسان کہلاتے ہیں۔ اور ہمیں زیورِ نطق عطا ہوا ہے۔ زمانہ خوددار ہے۔ اور ہم زمانہ میں رہتے ہیں۔ زمانہ ہم پر غالب ہے اور ہم مغلوب ہیں۔ زمانہ چاہتا ہے کہ ہم اُسی کے رنگ میں رنگے جاکر اخلاقی پہلو سے قائم رہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اُس کے رنگ میں رنگے جاکر اُسی کی طرح خوددار ہوں۔

اگر ہم اس جادہ مستقیم سے منحرف ہیں۔ تو ہمیں اپنے تئیں آنکھیں مینچ کر کسی اندھے کوئیں میں گرادینا چاہئے۔ پہ اس سے بہتر ہے۔ کہ ہم اس دُنیا میں ذلّت کے ساتھ زندہ رہیں اُٹھو تازیانہ خودی سے سوتی نظرتیں اور خوابیدہ جذبات جگاؤ۔ ے

ملوتِ خود کن شعلۂ جوّالہ شو

عامیانہ الفاظ میں خودی

زندگانی از فرام پیہم است　　برگ و ساز ہستی موج رم است

بعض لوگ کہتے ہیں کہ خودی کی تائید بھی کیسے ہوسکتی ہے؟ یہ تو ایک روش مکروہ اور عمل متروک ہے۔ افسوس! لوگ غور کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ اور خودی سے کام لیتے اور خودی کے بھروسے پر ہی بُری بھلی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور پھر اس سے نفرت بھی کرتے ہیں۔ اگر ہم خودی سے کام نہ لیں تو ایک دم بھی زندہ نہ رہ سکیں۔ یہ خورد و نوش۔ یہ لباس یہ طریق بود و باش۔ یہ عمل مقارنت و موانست یہ روش تمدن خودی نہیں تو اور ہے کیا؟ یہ لباس خودداری نہیں تو اور کیا ہے؟ موسم گرما و موسم سرما میں جو ہم موسم کے مطابق خورد و نوش کرتے اور لباس پہنتے ہیں۔ یہ خودداری ہی تو ہے۔ دیکھو ذرا غور کرکے حضرت انسان خودی اور خودداری کی بدولت کہاں تک پہنچا ہے۔ اگر خودی کی سنح کام نہ کرتی تو یہ موجودہ تہذیب اور ترقی کہاں نصیب ہوتی جب تم

گھوڑے پر سوار ہوتے ہو تو گھوڑا اُس کی اپنی مرضی پر نہیں چھوڑ دیتے بلکہ اُس کی باگیں قابو میں رکھتے ہو۔ اگر ایسا نہ کرو تو محفوظ نہیں رہ سکتے۔ یہی تو خودی اور خودداری ہے۔ معمولی باتوں میں تو ہم اُس کا خیال رکھتے ہیں۔ لیکن غیر معمولی مراحل میں اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ حضرت اقبال نہیں اس معمولی خودی سے برنگ ارتقائی غیر معمولی خودی کے سٹیج پر لانا اور دیکھنا چاہتے ہیں وہ چاہتے ہیں۔ کہ جسطرح تم گھوڑے کی سواری میں گھوڑے کو قابو میں رکھتے ہو اسیطرح شبدیز احوال اور فرس زمانہ کی سواری میں خود کو قابو میں رکھو ضبط سے کام لو۔ ضبط ہی کا نام تو حضرت اقبال کی اصطلاح جدیدہ میں خودی اور خودداری ہے۔ ضبط نفس ہی سے تو مراد خودی ہے ضبط ہی تو زمانہ کا بڑا قانون ہے۔ ضبط ہی سے قوتیں اور جذبات اپنی اصلیت پر آتے ہیں۔ ریاضت مجاہدہ۔ عبادت تزکیہ ضبط ہی تو ہے۔ غیر مشروط کشادہ دلی ضبط کے منافی ہے۔ مشروط کشادہ دلی ضبط کے موافق اور شخصیتوں و قوموں کی جان اور زندگی ہے۔ بار بار مثنوی پڑھو اور دل سے پڑھو اور دیکھو کہ معمولی اور غیر معمولی یا حقیقی اور غیر حقیقی خودی میں کیا کچھ فرق ہے ؎

از خودی مگذر بقا انجام باش
قطرۂ باش و بحر آشام باش

خودی۔ شان اور اخلاق کا رشتہ

قانون نشاط مے نوازد
آں کس کہ زمانہ ساز باشد

انسان کو جس امر کے سیکھنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ کیونکر زندگی بسر کرنی چاہئے۔ زندگی سے بڑھکر انسان کو کسی اور چیز کی فکر نہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس سے زیادہ بے پرواہی بھی کسی اور امر میں نہیں کی جاتی۔

کامیابی مسرت و خوشحالی کا مدار ہماری حالتوں پر نہیں بلکہ اکثر ہماری ذات پر ہے۔ عیبوں کے ہاتھ سے برباد ہونے کی بجائے بہت سی ہستیاں اور بہت سے سلسلے خود اپنے ہی ہاتھ سے برباد ہوئے ہیں۔ انسان کا سب سے بڑا دشمن وہ ہے جو خود اُس کے سینہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ اگر وہ راست رو

تو حالت اچھی رہی ورنہ چرخ بگڑ گیا۔

باوجودیکہ دوسری کائنات پر حضرت انسان کا بہت کچھ شرف ہے لیکن پھر بھی انسانی تربیت اور اصلاح کے واسطے بہت سے ضوابط مختلف رنگوں میں مدوّن ہیں۔ مذہب۔ فلسفہ اور اخلاق اگرچہ جُدا جُدا ناموں سے موسوم ہیں لیکن ان سب کی اصلی غرض یہی ہے کہ انسانی جذبات اور انسانی قوتوں کی صلاحیت عمل میں آئے۔ ہم اس کے ساتھ ہی یہ بھی پاتے ہیں کہ خود انسانی فطرت میں بھی ایسی خواہش صلاحیت موجود ہے۔ ہمیں غور کرنا چاہئے کہ فطرتی عناصر میں سے کونسا عنصر ایسی صلاحیتوں کا موید ہے۔ میری رائے میں سب سے زیادہ اس کا جذبہ خودی اور خودداری ہی موید ہو سکتا ہے۔ انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے۔ کہ بڑھے نہ کہ ایک ہی حالت پر پڑا رہے۔ چاہے وہ افزائش اور ترقی معادی رنگ میں ہو اور چاہے معاشری پہلو سے انسان کی فطرت میں یہ خواہش پائی جاتی ہے۔ اور سب جذبات میں سے اس کی حامی خودی ہی ہے۔ خودی ایک اولوالعزمی ہے۔ اور اولوالعزمی ان افعال کی محرک ہوتی ہے۔ جو شخص خود اپنی نگاہوں میں ہی اولوالعزم نہ ہو یا اپنی صداقت کا معترف نہ ہو۔ وہ اندرونی نظروں میں کب اولوالعزم اور صادق ٹھیر سکتا ہے۔ دو کیفیتیں بظاہر متضاد نظر آتی ہیں۔ مگر اُن کا آپس میں ایک قریبی رشتہ ہوتا ہے۔ اور اُنہیں ایک ہی ساتھ نبھنا بھی چاہیئے۔

(الف) مردانہ پابندی اور مردانہ آزادی۔

(ب) مردانہ اعتماد نفس اور مردانگی کے ساتھ اپنے اُوپر بھروسہ۔ یہی چلن ہے اور یہی کیریکٹر انسان اگر اپنے تئیں اپنے سے زیادہ بلند درجوں پر فائز کرنے کی کوشش نہ کرے تو وہ ایک پست ہمت ہستی ہوگی۔ ہمارا ارادہ یہی رہنا چاہیئے کہ ہم اپنے آپ کو معادی اور معاشری رنگ میں درجہ کمال پر پہنچائیں۔ جیسے کہ ہمیں اعلےٰ قوتیں دی گئی ہیں۔ ویسے ہی علو بھی ہم چاہ سکتے ہیں۔ ان سب کوششوں کا نام شان ہے۔ انسان طبعاً شان کا خواستگار ہے۔ چاہے کسی رنگ میں ہو۔ ان مراحل پر پہنچنے کے واسطے مذہب،

فلسفہ اور اخلاق ایک ذریعہ ہیں۔ اور اِن سب کی جڑ خودی ہے یا خودداری جب ایک
شخص باوجود ضرورت کے بھی رشوت نہیں لیتا۔ چوری نہیں کرتا۔ ڈاکہ نہیں مارتا۔ فریب سے
مال ومتاع حاصل کرنے سے پرہیز کرتا ہے۔ وہ کیوں ایسا نہیں کرتا۔ صرف اِس واسطے
کہ اس کی خودی اور خودداری اُسے روکتی ہے۔ اُسے شرم دلاتی ہے۔ کیا کوئی فطرت ایسی اجازت
دیتی ہے یا ایسے فتوے پر فطرت کا قاضی مہر کرتا ہے۔ اُسے ایسا کرنے سے کونسی قوت اور
کونسا جذبہ روکتا ہے۔ وہی جسے حضرت اقبال خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب خودی نہیں
رہتی یا اپنی شان کا خیال ہمارے دل ودماغ سے مٹ جاتا ہے۔ تو ہم بداخلاقیوں سے
مجتنب نہیں ہو سکتے۔ اخلاق کا پہلا اصول اور پہلا ضابطہ خودی اور خودداری ہے۔
جب تک خودی نہ ہو۔ اخلاقی ضابطہ عمل میں آ ہی نہیں سکتا۔ خودی اور خودداری ہی صلاحیت
اور خوش اخلاقی کی جڑھ ہیں۔ ایک شخص ایک خوابیدہ آدمی کے کھلے جیب میں کچھ پونڈ پاتا ہے
اگر وہ بدنیتی سے نکال لے تو اُس پر کوئی شک وشبہ نہیں ہو سکتا۔ اُس کے دل میں ایسا
خیال بھی آتا ہے۔ لیکن وہ یہ سوچ کر رہ جاتا ہے۔ کہ اُس کا یہ فعل کیا کچھ کیفیت اور قیمت
رکھتا ہے۔ اور اُس کا اثر خود اُس پر بھی کیسا اور کیا ہو گا۔ تو وہ فوراً نادم ہو کر خاموش ہو جاتا
ہے۔ سوچو کہ یہ خیال کیوں پیدا ہوا اور یہ کس قوت کی تحریک تھی۔ اگر یہ تحریک مذہب کے
ڈر یا خدا کے خوف یا دُنیا کی وجہ سے تھی تو اُس کی کوئی قیمت نہ ہو گی۔ لیکن اگر یہ آواز محض
اُس کے اندرونہ ہی میں سے آئی تھی۔ اور اُس کی دبنے والی خودی اور خودداری تھی تو یہ یک
رنگی اور مردانہ اعتماد نفس تھا۔ جو نہ تو کسی معاوضہ کے لالچ سے تھا۔ اور نہ کسی خوف کی وجہ
سے محض صداقت ہی صداقت تھی۔ جو حقیقی سعادت اور بے لاگ نیکی ہے۔ اسی عمل کا نام
خودداری اور خودی ہے۔ اور اسی کی ہمیں ضرورت ہے۔ اور اسی کی کمی اور تنزل اخلاقی
ضابطہ کے ضعف اور انتشار کا باعث ہے۔ اور اسی سے نظام اخلاقی پراگندہ ہوتا ہے
خودی اور خودداری بہت اندیشہ کا نام نہیں ہے۔ بلکہ صداقت پژوہی اور صداقت پسندی کا

اگرایک شخص صداقت کے معلوم کرنے پر بھی اُس کا خیر مقدم نہیں کرتا اُسے قبول کرنے سے بچتا ہے۔ تو وہ خودی کا خون کرتا اور خودداری کو برباد کر دیتا ہے۔ صداقت معلوم ہو کر اس کا قبول کیا جانا خودی اور خودداری کی پہلی شرط ہے۔ جس طرح بعض لوگوں نے خودی کا مطلب رعونت۔ نخوت اور تکبر سمجھ رکھا ہے۔ اسی طرح بعضوں کے نزدیک خودی اور خودداری صداقت پژوہی اور صداقت طلبی کی مزاحمت کرتی ہے۔ یہ ایک وہم اور گمان ہے۔ خودی ان دونوں مراحل سے نافر اور الگ ہے۔ خودی نام ہی صداقت طلبی اور صداقت شعاری کا ہے۔ مجھے ایک صداقت کا علم ہوتا ہے۔ مَیں باوجود انواع و اقسام کی تکلیفات کے بھی اُسے نہیں چھوڑتا اور اُس پر قائم رہتا ہوں یہ ایک خودی اور خودداری ہے۔

ہمیں ضابطہ اخلاق کی ضرورت ہے۔ اور شان کی بھی ضرورت ہے۔ یہ دونو باتیں یا دونوں کمالات اُسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ جب ہم میں خودی اور خودداری ہو۔ خودی اعتبار پیدا کرتی۔ اور معتبر و شاندار بناتی اور بڑھاتی ہے۔ دُنیا میں اعتبار بڑھانے اور معتبر بننے کا ذریعہ چاہے معاوی رنگ میں ہو اور چاہے معاشری صورت میں اعتبار ہی ہے۔ جس قوم اور جس شخصیت کا اعتبار نہیں وہ قوم اور وہ شخصیت پر زاغ سے بھی زیادہ ترکم قیمت اور بے حقیقت ہے۔ ذرا مثنوی اسرار خودی غور سے پڑھیے۔ اور پھر کہیئے کہ کس قدر زبردست مثالوں سے اخلاقی ضابطہ کی تجدید کی گئی ہے۔ اخلاق مردہ رنگ میں تھے۔ اُن کی پرستش مردہ تھی۔ اُن میں حسن اور جان نہ تھی۔ محض چمڑے کی جلدوں ہی میں اُن کا ذکر تھا۔ یا مکتبوں اور سکولوں کی چوکھٹوں تک ہی اُن کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ اُن میں رُوح ڈالی گئی ہے۔ اور اُنہیں چشمہ حیات ثابت کیا گیا ہے۔ ؎

از نیستاں ہمچو نَے پیغام دہ	قیس را از قوم حے پیغام دہ
نالہ را انداز نو ایجاد کن	بزم را از ہائے ہو آباد کن
روح نو مے جوید اجسام کہن	کمتر از قُم نیست اعجاز سخن

خیز و جانِ نو بدہ ہر زندہ را　　　از قُم خود زندہ تر کن زندہ را

ذرا ان اشعار مثنوی کو غور سے پڑھئے۔ تو ضابطۂ اخلاق ہاتھ باندھے کہہ رہا ہے کہ اسی قسم کے تازیانوں اور اسی قسم کی زندہ صلاحیتوں سے یہ مردہ ضابطہ اخلاق زندہ ہو سکتا ہے۔ للہ مردہ نہ بنو۔ اس ضابطہ اقبالی کو ایک زندہ ضابطہ اخلاقی سمجھو۔ اور اسکی برکت سے ادبار پر لات مارو۔ اُس کی پابندی اور صحبت سے اپنے محسوسات کو زندہ کرو۔ یہ سیاسی جھگڑے دیوانگیاں ہیں۔ اخلاقی میدان میں آؤ۔ اور قوائے ذہنیہ کو وسعت دیکر دکھاؤ۔ جن کا سرچشمہ خودی اور خودداری ہے۔

خودی اور اقتصادیات

وہ لوگ۔ وہ افراد قوم جو اپنے گھروں میں ایک عزت ایک آبرو کے ساتھ بہر حالت تنگی و فراخی میں گذر کرتے ہیں۔ جن کا دستِ سوال ایک مشکل کے بعد بھی دراز نہیں ہوتا جن کی زبان پر مشکلات پر بھی سوال نہیں آتا۔ جو اپنی حالت ہی میں مگن رہتے ہیں وہ دُنیا بھر میں قابل احترام ہیں اُن کی شرافت اُن کے استقلال پر کوئی حرف نہیں لایا جا سکتا یہی لوگ ہیں جو مشکلات سے تنگ آکر اقتصادیات حرفت و صنعت اور کاروبار کی طرف رفتہ رفتہ متوجہ ہوتے اور اپنے تئیں ان مشکلات سے نکال لیتے ہیں۔ یہی لوگ دُنیا میں عزت پاتے اور صاحب ہمت کہے جاتے ہیں۔ وہ کونسا جذبہ ہے۔ جو ان لوگوں کو اِس جادہ پر مستقیم رکھتا ہے۔ وہی جذبہ جسے دوسرے الفاظ میں خودی اور خودداری کہا جاتا ہے۔ جو انسان کی طبیعت کا ایک بے بہا خاصہ ہے۔ جو باوجود تکالیف اور مشکلات میں پڑنے کے بھی خواہ مخواہ دراغیار پر جانا شرافتِ انسانی کے مغائر خیال کرتا ہے۔ اُس وضع کو نباہے جاتا ہے جو وضع آبرو اور عزت رکھتی ہے۔ کہا کرتے ہیں فلاں آدمی بات پر جان دیتا اور نام پر مرتا ہے اگرچہ بعض اوقات بعض غلط کاریوں کی وجہ سے یہ خواص تکلیف دِہ ثابت ہوتے ہیں۔ بالخصوص

جبکہ اُن کے ساتھ ہٹ دھرمی اور ضد ناجائز شامل ہوتی ہے لیکن عموماً یہ خاصے انسان کی شرافت اور انسان کے احترام اور کامیابی کا موجب ثابت ہوتے ہیں۔ یہ تمام آثار اور تصرفات خودی اور خودداری ہی کے ہیں۔ جن لوگوں میں یہ جذبہ خودی نہیں ہوتا وہ اپنی عزت آپ نہیں کرتے۔ بات پر قائم رہنا یا قول کی لاج رکھنا اُن کے نزدیک کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی۔ دیکھو جن اقوام میں بدقسمتی سے گداگری لعنت خورے کثرت سے ہوتے ہیں اُن کی خودی اور خودداری ہمیشہ زیرِ سد مہ رہتی ہے۔ رفتہ رفتہ اُن میں سے غیرت اور حمیّت بھی اُڑ جاتی ہے۔ شبہ میں نہ پڑو شک نہ لاؤ!!

خودی غیرت کا دوسرا نام ہے

خودی اور غیرت ایک ہی آغوش کی پرورش یافتہ ہیں۔ ان دونوں میں نسبت ہی نہیں بلکہ یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ کبھی خودی کہتے ہیں اور کبھی غیرت کبھی شرم اور کبھی حیا۔ "اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانِ" جو انسان غیرت مند نہیں۔ وہ صرف نام کا انسان ہے۔ اُس کی ہستی ایک ایسی ہستی ہے جس کی دنیا میں کوئی قیمت نہیں۔ اگر میں غیورانہ مثالوں سے یہ ثابت کرنا چاہوں تو سینکڑوں نہیں ہزاروں مثالیں دے سکتا ہوں کہ غیرت کے جوش میں انسان کہاں تک پہنچا ہے لیکن چونکہ یہ بات ہر انسان بادنیٰ غور سمجھ سکتا ہے۔ اس واسطے اس کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

(ایک پنجابی کہاوت ہے) "منگن گیا سو مر رہیا مرے سو منگن جا"

کیسی جامع کہاوت ہے۔ اور کس خوبصورتی سے خودی اور خودداری کا اعلان کر رہی ہے۔ دستِ سوال دراز ہوتے ہی خودی کا نصف خون ہو جاتا ہے۔ احتیاج نامعقول احتیاجِ ناجائز غیرت اور خودی و خودداری کا ایک خوفناک دشمن ہے۔ تمام بہادرانہ ترقیاں اور شجاعانہ جذبات احتیاج ناجائز کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ۵

جملہ اسقامِ تو از ناداری است
اصلِ علّت ہائے ہمیں بیماری است

اے فراہم کردہ از شیراں خراج
گشتۂ روبہ مزاج از احتیاج

قطرتے کو بر فلک بندد نظر
پست مے گردد ز احسانِ دگر

از سوال افلاس گردد خوار تر
از گدائی گدیہ گر نادار تر

از سوال آشفتہ اجزائے خودی
بے تجلی نخل سینائے خودی

رزقِ خویش از نعمت دیگر مجو
موجِ آب از چشمۂ خاور مجو

چوں حباب از غیرت مردانہ باش
ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

وہی قوم سائنس، حرفت وصنعت اور اقتصادیات تجارت وغیرہ میں ترقی پذیر ہوتی ہے۔ جو اپنے دلوں میں جذبہ خودی اور خودداری رکھتی ہے۔ جو شخص حتے الامکان سوال کرنا برا خیال کرتا ہے۔ کیا وہ محنت ومشقت کی طرف نہیں دوڑے گا کیا وہ اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے اوطان میں جاکر رزق کی تلاش میں نہیں لگ جاویگا۔ کیا اس کی غیرت اس کی خودداری اُسے اپنے ملک میں بھیک کے ٹکڑوں پر ہی رہنے دیگی۔ اگر بہت سے لوگ بظاہر گداگر ہیں تو اکثر باطن میں بھی گدائی پیشہ رکھتے ہیں۔ جو لوگ کوئی کام نہیں کرتے ہمت سے کام نہیں لیتے علوم وفنون کی راہیں چھوڑ چھوڑ بیکاری وجہالت کی طرف جاتے ہیں۔ وہ بھی ایک قسم کے گداگر ہی ہیں۔ مسلمانوں میں ہزاروں گداگر ہیں۔ اُنکی روک اور کمی کیواسطے مختلف تجاویز پیش ہوتی ہیں حضرت اقبال نے خودی اور خودداری کی جو تجویز پیش کی ہے۔ اس کا مقابلہ کوئی تجویز بھی نہیں کرسکتی نہ سیاست سے مدد لو۔ اور نہ خواہ مخواہ گورنمنٹ سے کسی قانون کے جاری کرنے کی درخواست کرکے اُسے ایک تکلیف میں ڈالو۔ اپنے اندر خودی اور خودداری کا جذبہ پیدا کرکے دکھاؤ۔ اس جذبہ کے سوائے نہ تو گداگری بند ہوگی۔ اور نہ ہمتیں بند ھینگی۔ حضرت اقبال نے سو بات کی ایک بات کہی ہے۔ یہی چلتا ٹوٹکا ہے۔ اور اسی

فسوں میں اثر بھی ہے۔ ترقی یافتہ قوموں نے اسی سے کام لیا ہے۔ اور اسی پر اُن کا مدار ہے۔ ہر کام غیرت سے ہو سکتا ہے۔ اور غیرت سے ہونا چاہئے۔ جب غیرت ہی نہیں تو ہمت کیسے ہوگی۔

"ہمّتِ مرداں مددِ خُدا"

انگریزی راج کی یہ پہلی برکت ہے۔ کہ وہ جائز رنگ میں جذبات کو روکتا نہیں۔ اُس کی مامون حکومت میں مردانہ ہمت مردانہ پابندی مردانہ ضبط مردانہ غیرت اور مردانہ خودی کے چشمے کھلے ہیں۔ ان چشموں سے کام لو اور ان کے آبِ زُلال سے مردہ دلوں کو سرکار انگریزی کی صدہا برکتوں اور امن و امان کے ماتحت زندہ کر کے دکھاؤ۔ جب تک تم میں خودی اور خودداری نہ ہوگی۔ جب تک تم اس کے ترشّد اور ہدایات پر کاربند نہ ہوگے۔ تب تک تمہاری کوئی کل بھی سیدھی نہیں ہو سکتی تمہارے اخلاقی تمدّنی عروج اور شان کی یہی ایک کلید ہے۔ اور تم اسی کی بدولت اور اسی کی مدد سے معارج اخلاقی و تمدنی پر چڑھ سکتے ہو۔ اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ پھیل جاؤ! اقصائے مساجد۔ اقصائے ممالک میں اور اس اخلاقی مثنوی کا وعظ کرتے پھرو ہر واعظ کے ہاتھ میں اس کا ہونا ضروری ہے

خودی اور خطرہ

مذاہب اور اخلاق میں یہ کہا گیا ہے۔ کہ آزمائش مصیبت اور خطرہ کی حالت میں انسان کا اوّلین فرض یہ ہے۔ کہ وہ صبر و بردباری راست گوئی جُرأت و شجاعت سے کام لے جو لوگ مصائب اور خطرات میں صبر و بردباری و استقلال سے کام لیتے ہیں۔ ہر رنگ میں اُن کی تعریف کی جاتی ہے۔ ہر پہلو سے اُن کے افعال اُن کی ہمم اور اُن کے خیالات

کو سراہا جاتا ہے جس قوم اور جس نسل میں ایسے لوگ ہوتے ہیں وہ قوم اور وہ نسل دوسری قوموں اور دوسری نسلوں کے مقابلہ میں ایک ممتاز اور باہمت قوم شمار ہوتی ہے مصیبتوں اور خطرات کے وقت وہ کونسی قوت اور کونسا جذبہ ہے۔ جو انسان کو حوصلہ اور استقلال میں رکھتا ہے۔ وہ کونسی طاقت ہے جو صفحۂ ہمت پر حرفِ غلط نہیں آنے دیتی وہ کونسی اخلاقی قوت اور اخلاقی جذبہ ہے۔ جو مایوسی اور مصیبت کے وقت تمام مادی قوتوں اور مادی تصرفات پر غالب آکر قائم اور ثابت رہتا ہے۔ وہ کونسا زبردست ولولہ ہے جو اپنی سچی اور واقعی بات کی تہ کرتا اور جادۂ صداقت نہیں چھوڑتا۔ وہ کونسا جوش ہے جو باوجود انواع و اقسام کی ناامیدیوں اور ہزیمتوں کے بھی جادۂ راستی سے منہ نہیں موڑتا۔

اگر غور سے دیکھو گے تو وہ قوت۔ جذبہ۔ طاقت۔ اخلاقی قوت۔ ولولہ اور جوش خودی اور خودداری ہی تو ہے۔ جس شخص یا جس طبیعت میں خودی اور خودداری کا جذبہ و ولولہ نہیں ہوتا اُس میں ہمت۔ حوصلہ۔ استقلال اور جوش بھی نہیں ہوتا خطرہ اور مصیبت کے وقت انسان کی قوتیں اور انسان کے جذبات پر ایک صدمہ ہوتا۔ اور زد پڑتی ہے۔ بڑی بڑی باحوصلہ طبیعتیں اور دل و دماغ بھی دل چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اگر کوئی قائم رہتا ہے۔ تو وہی جو خودی رکھتا اور مراحلِ خودداری سے آشنا ہے۔ کامیابی اور مسرت ہمیشہ ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دیتی ہیں۔ ہم اکثر اوقات کامیاب اور سرسبز ہونے پر بھی مسرور نہیں ہو سکتے۔ مسرت اُسی صورت میں ہو سکتی ہے۔ جب ہم طمانیت کے مالک ہوں یا ہمیں اطمینان حاصل ہو۔ طمانیت کب ملتی ہے۔ جب ہم سے ایسے افعال سرزد ہوں جو باوجود انواع و اقسام کی تکالیف اور مایوسیوں کے بھی اپنے اندر ایک صداقت کی روح۔ ہمت۔ حوصلہ اور وقار رکھتے ہوں۔ ایک راستگو جب کبھی راستگوئی کے عمل سے تکلیف اُٹھاتا ہے۔ تو گو اُس کا نظامِ جسم ایک تکلیف میں ہوتا ہے۔ لیکن

اُس کی روح ایسی تکلیف اور مایوسی کا احساس نہیں کرتی۔ کیونکہ اُس کا ضمیر اِس پر شاہد ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے اندر کوئی کثافت کوئی غلاظت نہیں رکھتا۔ اُس کا عمل صادقانہ اور اُس کا فعل مردانہ ہے۔

جس طرح انسان اور حیوان حرارتِ غریزی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور حرارتِ غریزی ہی اُس کے افعالِ مردانہ کا موجب ہے۔ اسی طرح خطرات اور مصائب میں خودی اور خودداری ہی ایک ممتاز اور اعلیٰ عنصر ہے۔ دُنیا خطرات کا گھر ہے۔ خطرات کے بغیر انسان کامیابی کا مُنہ نہیں دیکھ سکتا۔ خطرات کا مقابلہ حوصلہ ہمّت اور استقلال ہی سے ہو سکتا ہے۔ اور حوصلہ۔ ہمت اور استقلال سوائے خودی اور خودداری کے وجود پذیر نہیں ہو سکتا۔ جو شخصیت اور ذہنیت خطرات کا مقابلہ خودی اور خودداری سے نہیں کرتی۔ وہ اپنی ہستی کی دُشمن اور بدخواہ ہے۔ حضرت محمد عربی صلعم کی اکثر احادیث اور اکثر تعلیمات میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اگر ہم سے سچ سچ پوچھو تو حضرت محمدؐ عربی صلعم خودداری کا دُنیا بھر میں ایک صادق نمونہ تھے۔ جب ایک دشمنِ دین نے حضرت کو اکیلے پا کر یہ کہا کہ میری تلوار سے اب آپ کو کون بچا سکتا ہے۔ تو آنحضرت نے جو کچھ اس کے جواب میں کہا وہ موحدانہ خودداری ہی کا اثر اور نتیجہ تھا۔ جس نے محمدؐ عربی صلعم کو سمجھا وہ فلسفہ خودی اور عمل خودداری کو سمجھ گیا۔

جنونِ خودی اور ناجائز تفاخر

پیرا واقف کنم تقلید مجنوں ۔۔۔ کہ من در عشق صاحب اجتہادم

ایک حضرت فرماتے ہیں "خودی تو جنون تفاخر ہے۔ خودی ایک دیوانگی ہے"۔ حضرت اقبال لوگوں کو مجنوں اور دیوانہ بنانا چاہتے ہیں۔ لوگوں کی ٹھہری ہوئی طبائع اور سرد ضمائر میں حرارت تفاخر پیدا کر کے اُن تسکین بخش مراحلِ اخلاقی سے دُور لے جانا چاہتے

ہیں۔ جو مدتوں سے زیرِ مشق ہیں۔ اسی قسم کے مغالطوں اور ٹھوکروں کی وجہ سے ہم اُن مراحل سے ناآشنا ہوتے گئے ہیں۔ جو احساسِ نفس اور اعتمادِ نفس کے مراحل ہیں اپنے تئیں چھوٹا اور حقیر سمجھنا اور اپنی ہستی کی خود تحقیر کرنا انسانیت سمجھ رکھی ہے۔ حالانکہ یہی روش پایۂ انسانیت کے خلاف ہے۔ خودی جنون نہیں۔ خودی دیوانگی نہیں۔ خودی ہوشیاری ہے۔ خودی فرزانگی ہے۔ نظامِ قدرت کی پر اسرار حقیقتوں اور کیفیتوں کی رگ رگ سے خودی کا اظہار ہو رہا ہے۔ یہ وہ جنون ہے۔ جو ہستی کا مایۂ ناز اور ثبوتِ فراست ہے۔ خودی اور خود انگاری ہی کی بدولت یہ کارخانہ چل رہا ہے۔ اسی سے اقوام و ملل کی موت اور زندگی وابستہ ہے۔ حسیاتِ خودی اور حسیاتِ خودداری جنون تفاخر نہیں ہیں۔ بلکہ فراستِ انسانی جب یہ جنون عام ہو جاتا ہے۔ تو شخصیتیں نبتی عروج پاتی اور قومیں ترقی پذیر ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کی قوم اسی جنون سے بڑھی اور یہی جنون اُسے اقصائے عالم تک لے گیا۔ اسی کی بدولت اُن کا شہرہ روحانی رنگ میں کرّوبیوں تک پہنچا۔ اور اسی دیوانگی کی بدولت دولت ثروت برکت شرافت کرامت اُن کی غلامی میں آئی۔ اِسی پر اسلاف کو فخر تھا۔ اور یہی اُن کا مایۂ ناز تھا۔ یہی اُن کا متن تھا۔ اور یہی اُنکی تفسیر اور حاشیہ تھی۔ ایک جاہل سے جاہل آدمی بھی اس جنون میں ایسا انہماک رکھتا تھا کہ ہزاروں فراستیں اُس کے مقابلہ میں ہیچ تھیں۔ تمام دُنیا کی سائنسیں تمام دُنیا کی خوبیاں اور کمالات ایسے مجنون کی غیرت اور خودداری کے سامنے بے حقیقت تھے۔ تم نے پڑھا ہو گا کہ ایک بدوی صحابی دربارِ ہرقل روم میں کس جنون کس وقار کس احترام اور کس استواری کے ساتھ حاضر ہوا تھا۔ اور اس کی طبیعت کس جنون اعلائے کلمۃ اللہ کی زد میں تھی۔ وہ تن تنہا نہ تو ملک فتح کرنے گیا تھا۔ نہ تلوار چلانے صرف اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے۔ یہ وہی جنون تھا جسے تم جنونِ خودی کہتے ہو۔ یہ وہی خودداری تھی۔ جس کی حضرت اقبال درد بھرے دل سے یاد دلاتے ہیں۔ خودی ناجائز تفاخر نہیں۔ خودی تکبر نہیں خودی رعونت نہیں۔ خودی

خود حفاظتی۔ خود ضبطی۔ خود طلبی خود نمائی اور خود سازی ہے۔ اگر جائز اور مشروط تفاخر بُرا اور مذموم ہے تو قومیں اپنی قومیت پر کیوں فخر کرتی ہیں۔ خودی وہ جنون ہے جو قوموں کو زندہ کرتا اور مردوں میں رُوح ڈالتا ہے۔ یہ وہ جنون ہے جس سے اخلاق میں جان پڑتی اور افعال و اعمال میں زندگی حلول کرتی ہے۔ پاسِ خودی کا جنون ہی زندگیوں کے واسطے منازل ترقیات کا پروانہ اور پاس راہداری ہے۔ اسی پروانہ اور اسی پاس پورٹ سے قومیں اور شخصیتیں سواحلِ ارتقاء سے عبور کرتی ہیں۔ اس کے فقدان سے آج بعض قومیں بےخود ہو رہی ہیں۔ اور اسی کی بدولت بعض قومیں دولتِ اقبال سے مالامال ہیں۔

عیبم نہ کنی ز مستیٔ عشق ۔ ایں لازم نشۂ جوانی است

نہ تو فطرت خودی کی مخالف ہے۔ اور نہ ضمیر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ کیوں اسے جنون قرار دیا جاتا ہے۔ اور کیوں اس کا نام بیجا تفاخر رکھا جاتا ہے۔ تفاخر مشروط بھی بُرا اور مذموم نہیں اگر ہم اپنی خوبیوں اپنی عمدگیوں اور اپنی اچھائیوں اور محاسن پر فخر کرتے ہیں تو یہ کوئی برائی نہیں جو فطرت اچھی ہے۔ اُس کا حق ہے کہ وہ فخر کرے تفاخر وہی بُرا ہے۔ جو حقیقت کے خلاف ہو جس میں حقیقت کی جھلک نہ ہو۔ تعریف چاہنا تعریف پر خوش ہونا ذہانت کی علامت ہے۔ جو شخص ایسا احساس نہیں رکھتا وہ ذہانت سے نابلد ہے۔ خودی اور ذہانت میں ایک نسبت ہے۔ ذہانت بھی ایک زندگی ہے۔ اور خودی بھی ایک زندگی رکھتی ہے۔ اُس فرزانگی سے جنون خودی اچھا ہے جو اپنے ساتھ احساس نہیں رکھتی جو بوسیدہ اور مردہ ہے۔ مبارک ہیں وہ روحیں جو جنون خودی سے اصلی فرزانگی کی وارث بنتی ہیں۔ ے

ترا کہ گفت کہ مائل بہ سیر بستاں باش ۔ بنوش یکدو سہ جامے و خود گلستاں باش

خودی اور تصوف

بعض وقت بعض انفعالی تاثرات انسانی جذبات پر ایسے مؤثر اور حاوی ہوتے ہیں۔ کہ اُن کی حقیقت اور اصلیت ہی گم ہو جاتی ہے۔ گو صحیح فطرت ایسے انفعالی تاثرات کا ایک بڑی حد تک مقابلہ کرتی ہے۔ مگر رفتہ رفتہ وہ بھی ضعیف پڑ جاتی ہے۔ اکثر یا بعض طبائع انسانی میں سے جذبہ خودی کی کمی یا سرے سے ہی غیر مستند خودساختہ اور علم صوفیانہ خیالات کی وجہ سے شروع ہوتی ہے۔ گو صوفی ازم صوفی مشرب خودی کے منافی اور مخالف نہیں مگر بعض لوگوں کے نزدیک صوفی ازم کا پہلا سبق یہ ہے کہ خودی مار دی جاوے۔ جب تک خودی نہ مار دی جاوے تب تک وہ درجے اور وہ امتیازات حاصل نہیں ہو سکتے۔ جو صوفی مشرب کا مطمح نظر ہیں یا یہ کہ بغیر خودی مارنے کے کوئی صوفی بن ہی نہیں سکتا۔ یہ خیالات اگرچہ بعض صوفی حلقوں کے اندر پائے جاتے ہیں۔ لیکن صحیح صوفی ازم سے انہیں کوئی نسبت نہیں۔ یہ ایسے ہی حواشی ہیں جیسے ہمیشہ بعض مسلمات پر لگائے جاتے ہیں۔ اسلامی صوفی ازم کی بنیاد قرآن۔ احادیث اور سنت اسلاف ہیں۔ قرآنی فلسفہ یا اسلامی فلسفہ اُس تصوف کی حمایت نہیں کرتا جو خودی کا مارنے والا یا جو ایسی خودکشی کو جائز رکھتا ہے۔ اسلام صاف الفاظ میں کہتا ہے:۔

لا رهبانية في الاسلام

اسلام زہد و ریاضت۔ مراقبہ و مجاہدہ سے بند نہیں کرتا لیکن یہ نہیں کہتا کہ تم خودکشی کر لو یا اپنے اُن جذبات کا خون کر دو۔ جو تمہیں مہمات معاوی اور معاشری کے انصرام کے واسطے دیئے گئے ہیں۔ اکثر لوگوں نے حضرات صوفیائے کرام کے مجاہدات اور ریاضتوں کا مطلب غلط سمجھا ہے صوفیائے کرام کے مجاہدات اور اعتکافات خودکشی کے مترادف نہیں ہیں بلکہ ایک دائمی اور فوق ہمت از زندگی اور تازہ دم حیات کے۔ صوفیائے کرام جیسے فخر اسلام ہیں ویسے ہی ان کے اقوال و افعال بھی واجب الاحترام ہیں۔

متخاصم قوتیں اور خودی

موجودات عالم میں تنازع للبقاء ہر قسم کی صحیح ترقی کی بنیاد ہے۔ کل چیزیں جو اس کائنات میں موجود ہیں۔ بتلا رہی ہیں یا ثابت کر رہی ہیں کہ ہم متخاصم قوتوں کا نتیجہ ہیں مجادلہ اخلاقی اور مجادلہ اقتصادی انسان کی زندگی میں محض تباہ کن نہیں ہے۔ بلکہ ایک زندگی بخش اصول ہے۔ البتہ اس کے مقابلہ میں مجادلہ سیاسی ایک تباہ کن مجادلہ ہے۔ مجادلہ اخلاقی و مجادلہ اقتصادی ہمیشہ بہ مختلف پہلو سیاسی مجادلوں پر غالب آتا رہا ہے۔ کل سوشل صفات کل خیالات کل ایجادات انتظامات اور کل تصرفات خود سوشل نظام اخلاقی مجادلہ کا نتیجہ ہیں۔ اندرونی سوشل مجادلہ انسان کا روزانہ کام ہے۔ ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم سیاسیات سے ہٹ کر اخلاقیات اور اقتصادیات کی جانب رجوع لائیں۔ اور متخاصم قوتوں اور متخاصم جذبات کی چوسر میں بازی لے جا کر اخلاقیات اور اقتصادیات میں تفوق اور امتیاز پیدا کریں۔ اس سے زیادہ ہمارے واسطے اور کوئی کامیابی نہیں ہے۔ متخاصم قوتوں اور متخاصم جذبات کے نرغہ اور کشمکش سے ہماری کشتی زندگی صرف ایک ہی طرح نکل سکتی ہے۔ کہ ہم خودی اور خودداری سے کام لیں۔ خودی ہی ایک ایسی طاقت یا ایسا جذبہ ہے۔ جو ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے۔ کہ ہم عالم یاس میں بھی حوصلہ نہ ہاریں۔ جب دو قوتیں باہمی منازعت کی وجہ سے ہمارے واسطے حیرانگی کا موجب ہوں۔ اس وقت صرف ایک قوت خودی ہی ہے جو ہماری دستگیری کرتی ہے۔ خودداری ہی ہے۔ جو ہماری ڈھارس کا موجب ہوتی ہے متخاصم قوتوں کی مثال اخلاط اربعہ صفرا۔ سودا۔ بلغم اور خون سے دی جا سکتی ہے۔ اور اخلاط کا ہمیشہ باہم مقابلہ رہتا ہے۔ ہر خلط خواستگار ہے کہ دوسرے پر غالب رہے۔ ان میں جب کوئی عنصر کم و بیش ہو جاتا ہے تو دوسرے عناصر کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اور مزاج بگڑ جاتا ہے طبیعت مدبر ہے۔ جبتک اس کا زور اور دخل باقی رہتا ہے تب تک ان کا قوام اور امتزاج صحیح اور

درست رہتا ہے۔ اور جب طبیعت کا تدبّر کمزور پڑ جاتا ہے۔ تو ان اخلاطِ اربعہ کا قوام اور مزاج بھی فاسد ہو کر فساد پیدا کرتا ہے۔ اور انسان رفتہ رفتہ امراض و عوارض کی زد میں آجاتا ہے اسی طرح خودی اور خودداری بھی متخاصم قوتوں کے درمیان ایک مدبّر طبیعت ہے۔ جب تک انسان اس سے کام لیتا ہے۔ آب و تاب۔ عزّت و احترام باقی رہتا ہے۔ اور جب وہ درمیان سے نکل جاتی ہے عزت و احترام اقبال و اکرام بھی باقی نہیں رہتا۔

جب متخاصم قوتوں میں سے ایک قوت یہ کہتی ہے کہ خود بے ہمت سست بنکر اندوختہ اغیار پر ہی سب کچھ انحصار کیا جاوے تو دوسری طرف ایک دوسری قوت وضع داری اور غیرت یہ کہتی ہے۔ کہ یہ تو مردانگی کے خلاف ہے۔ اخلاقی تندرستی کا عظیم الشان اصول اس سے مغائر ہے۔ اس سے اخلاقیات کا تحفظ نہیں رہتا۔ حقیقی تدبّر اور غیورانہ الوالعزمی پر حرف آتا ہے۔ کیونکہ آدمی ہمیشہ مردانگی کے الوالعزمانہ مقاصد ہی سے نشوونما پاتا ہے۔

ان دونوں متخاصم قوتوں میں فیصلہ کرنے والی قوت خودی یا خودداری ہی ہوتی ہے۔ اور اس کا فیصلہ ناطق ہوتا ہے۔ اور اس ناطق فیصلہ سے اُس اخلاقی تعطل اور دماغی سکون کے واقعہ ہونیکا اندیشہ رفع ہو جاتا ہے۔ جس کا انجام ترقی معکوس ہے۔ روحانی اور مادی خوشحالی اُس صورت میں ہو سکتی ہے۔ جب الوالعزمانہ مردانگی۔ خود بینی اور خود فہمی و خود سازی موجود ہو اور یہ موجود نہیں ہوتیں۔ جب تک متخاصم قوتوں میں کوئی زبردست حکم نہ ہو اور وہ زبردست حکم سوائے خودی کے اور کوئی نہیں۔ قرآن مجید ہر رنگ میں ہمیں اعلیٰ مراتب پر پہنچانا چاہتا ہے۔ قرآن مجید اخلاقیات کو ضائع اور کمزور کرنے کے واسطے نہیں آیا ہے۔ وہ اس واسطے آیا ہے۔ کہ قوتوں اور جذبات کی صحیح رفتار پر ہمیں چلائے اور اُس کی یہ چال عین فطرت اور اقتضائے فطرت کے مطابق ہے۔ کیونکہ کوئی فطرت اس کائنات میں گر کر نہیں رہنا چاہتی حکومت اور سیاست میں گرچہ کوئی قوم گر جائے مگر تمدن اور اخلاق میں نہیں گرنی چاہیئے۔

26230

قرآن زور سے کہہ رہا ہے کہ اپنی قوّتوں کو مارو نہیں بلکہ اپنی قوّتوں اور جذبات سے صحیح طور پر کام لو جو کچھ اُن میں ودیعت کیا گیا ہے۔ جو کچھ اُن میں بھرا گیا ہے اُسے وزن کرو اور اُس کے صحیح استعمال کا طریقہ سیکھو۔ قرآنی محاورات کے مطابق حقیقی انسانیت کے مراتب دو پہلو رکھتے ہیں :-

(الف) ترقی خصائل۔

(ب) اعلےٰ خیالات کی عملی تکمیل۔

سارے قرآن مجید کا یہی خلاصہ ہے۔

قرآن مجید غیر عملی خوابوں کی کوئی تعبیر نہیں بتاتا۔ وہ ہر ایک رنگ میں فطری جذبات سے اُٹھانے اور قائم رکھنے پر زور دیتا ہے۔ وہ کل سیاسی مخاصمات کو بہ منشائے تداول ایّام الگ کر کے یا اپنی ذات سے وابستہ رکھ کر قوتوں اور جذبات کی اصلاح پر توجہ دلاتا ہے۔ ہمارا یہ اخلاقی فرض ہے کہ ہم اپنی قوتوں اور اپنے جذبات کے ساتھ وفادار رہیں۔ ہم یہ فرض اُس وقت تک پورا نہیں کر سکتے تاوقتیکہ ہم ایک ضروری قوّت سے بھرپور نہ ہوں۔ وہ ضروری قوت کیا ہے؟ خودی! خودی! خودی! خودداری! خودداری! خودداری! وہ چیز جس کے سامنے دُنیا کی تمام مصیبتیں تمام تکلیفیں جھک جاتی ہیں۔ انسان کی اصلی طاقت ہے اور وہ جذبہ خودی اور خاصہ خودداری ہے۔ خودی اور خودداری چھوڑ دینا اور اس سے چشم پوشی کر لینا اُن اقوام اور اُن نسلوں کا خاصہ ہے۔ جو قعرِ ذلّت میں گر چکی ہیں۔ جن میں برائے نام بھی حس اور غیرت نہیں رہی۔ دم لینا اور سانس بھرنا جینا نہیں ہے۔ بلکہ جینا یہ ہے کہ حسّیات زندہ رکھ کر جیے۔ جو شخص بدقسمتی سے مختلف اطعمہ و اشربہ کھا پی کر بھی مزہ اغذیہ اور اشربہ سے واقف نہیں ہو سکتا جس کی قوّت ذائقہ ختم ہو چکی ہے اس کے واسطے شیریں اور تلخ یکساں ہیں۔ وہ خاک اور آبِ حیات میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا۔ انسان کی ذات میں صرف ایک خودی ہی کا ایک ایسا خاصہ ہے جو احساس

رکھتا اور احساس رکھواتا ہے۔ خدا خوش رکھے حضرت اقبال کو کہ ایک بے حس گروہ میں سے اِن کے دل و دماغ میں یہ احساس ہوا کہ اخلاقی جمود اور دماغی سکون قوم اور افرادِ قوم میں کہاں تک پیدا ہو چکا ہے۔ اور وہ حس جو قرآن اور محمدؐ عربی کی بدلت قوم اور افراد قوم میں پیدا ہو چکی تھی۔ اُس کا حشر رفتہ رفتہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ وہ میانہ روی وہ متانت وہ پختہ کاری وہ سنجیدگی وہ استواری وہ غیرت وہ جراَتِ اخلاقی جو زمانہ بھر میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھی کہاں گئی اور اُس کا حشر کیا ہوا؟ یہ ترپ تھی یہ جوش تھا جس نے حضرت اقبال کے قلم سے مثنوی نکلوائی۔ یہ حیرت تھی جس نے حضرت اقبال کو اس آئینۂ خودی کے دکھانے پر مجبور کیا۔ یہ درد تھا جس نے اقبال کو بھی آٹھ آٹھ آنسو رلا دیا یہ غیرت اور حمیت تھی جو اسرار خودی کے رنگ میں حضرت اقبال کی زبان سے نکلی۔ یہ وہ شاعرانہ الہام ہے جو کہ شاعروں کو قومی اخلاق کی اصلاح اور درستی کے واسطے وقت پر ہوا کرتا ہے۔ یہ وہ لسان الغیب ہے جو ہر صحیح اور ممتاز فطرت کے منہ میں رکھی گئی ہے یہ ہر شاعر کا حصّہ نہیں ؎

بشو اوراق گر ہم درس مائی — کہ علم عشق در دفتر نہ باشد

جو نغمہ اقبال سنا رہا ہے کوئی ہے جو اُس کا ہم نوا ہو کوئی ہے جو اُسے سمجھے! ؎

شعلہ ہا آخر ز ہر مویم دمید — از رگ اندیشہ ام آتش چکید

عندلیبم از شرر ہا دانہ چید — نغمۂ آتش مزاجے آفرید

شمع را تنہا تپیدن سہل نیست — آہ یک پروانۂ من اہل نیست

کوئی وقت آویگا کہ سوتی ہوئی روحیں بے حس دل و دماغ اخلاقی رنگ میں ہم نوائے اقبال ہوں گے۔ جوان اُس کا ورد کرینگے اور بوڑھے اُس سے گرم جوشی پیدا کریں گے۔

ایں امانت بار گیر از سینہ ام — خار جوہر برکش از آئینہ ام

یا مرا یک ہمدم دیرینہ دہ — عشق عالم سوز را آئینہ دہ

جب ایک صوفی یہ کہتا ہے کہ تزکیہ نفس کرو تو اُس سے اُس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ نفس کشی کرو بلکہ یہ کہ نفس کے تزکیہ سے اُس کی حقیقت پر روشنی ڈالو۔ "التزکیۃ تقویۃ" کا تزکیہ سے ہمیشہ صفائی اور تقویت ہوتی ہے۔ ارتقاء سے مراد علو مراتب ہے نہ کہ تنزل مراتب خودی اور تصوف میں مغائرت نہیں بلکہ خودی کا قائم رکھنا اور صحیح طریقہ سے اُس کا استعمال میں لانا ایک مستند اور قرآنی تصوف ہے۔ صوفی کے معنی یکسو ہونا اور خواہشات رذیلہ سے پاک ہونے کے بھی ہیں یک سو ہونا اور خود کو رذائل سے پاک صاف رکھنا دائرہ خودی سے باہر نہیں خودی بھی تو یہی ہے کہ ہم اپنے تئیں صحیح پہلو سے قائم رکھیں اور اپنی قوتوں اور جذبات کا صحیح رنگ میں استعمال کریں۔ صوفی زہد و ریاضت سے کیا چاہتا ہے۔ مراقبہ و مجاہدہ کس غرض سے کرتا ہے۔ صرف اس غرض سے کہ اُس کی روح اُس کی قوتیں روشن ہوں اور اُسے وہ حاصل ہو جو وہ حاصل کر سکتا ہے۔ وہ اُن مراتب تک پہنچے جہاں تک وہ پہنچ سکتا ہے۔ اور جو اس کی روحانی زندگی کی غایت ہو سکتے ہیں۔ اور جو معادی رنگ ہیں اعلیٰ اور برتر ہیں کیا ایک صوفی کی یہ خواہش خودی کے خلاف ہو سکتی ہے۔ خودی ہی تو اُسے ان راہوں سے لے جاتی ہے۔ فلسفی ایک رنگ میں اپنی ذات کی قوتوں اور جذبات کا تماشا کرتا ہے اور صوفی دوسرے رنگ میں۔ کسی صوفی نے یہ نہیں کہا کہ ذلیل طور پر اپنی خودی مار دو۔ بلکہ یہ کہا ہے۔ کہ خودی کو پاک کر کے اُس کے محاسن اور برکات سے خود کو مستفیض کرو۔

یہ سخت غلطی ہے کہ ہم صوفی ازم کو خودی کے منافی خیال کرتے ہیں۔ حضرت اقبال اُس خودی کو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ جو بلند نہیں بلند پرواز مستند اور فخر ملت صوفیوں کا ہمیشہ مطمح نظر رہی ہے حضرت خواجہ اجمیری۔ محی الدین اکبر عربی پیر دستگیر حضرت نظام الدین اولیاء حضرت بابا فرید شکر گنج وغیرہم بزرگان ملت کی سوانح عمریاں پڑھ کر دیکھو کہ یہ کس قسم کی بے داغ خودی کے مالک تھے۔ خودداری اُن کا پہلا زینہ تھا۔ اُن کا تصوف خودی اور خودداری سے وہی نسبت رکھتا ہے۔ جو خودی کو فطرت انسانی سے ہے۔ صادق

صوفی وہی ہے جو خوددار ہے۔ مشروط خودداری صوفی کا پیراہن زیبا اور مراقبہ اولین ہے ؎

آتش از خشم مزن سینہ صد چاک مرا — کہ دریں کہنہ قفس مرغ خوش آوازے ہست

علوّ فطرت اور خودی

اے کہ مثلِ گُل زگِل بالیدۂ — تو ہم از بطنِ خودی زائیدۂ

نظام انسانی کے ممتاز اور بار آور اجزا میں سے فطرت ہی ایک ایسا جزو ہے۔ جس پر انسان ہی کو نہیں بلکہ قدرت کو بھی فخر ہے۔ ہر خلقت اپنے اپنے رنگ میں فطرت رکھتی ہے۔ لیکن انسانی فطرت کی عظمت و کیفیت کچھ اور ہی ہے۔ انسانی فطرت اُن تمام خوبیوں عمدگیوں اور امتیازات کی وارث اور کفیل ہے۔ جو انسان کے شرف اور عظمت کا موجب ہیں۔ اسی پر تمام قوّتوں اور تمام طاقتوں اور تمام جذبات کے انفعال تاثرات اور کیفیات کا مدار ہے۔

آؤ ہم اپنی اپنی فطرت سے پوچھ کر دیکھیں کہ وہ اس کائنات میں کیا کچھ چاہتی۔ اور کس طرح رہنا پسند کرتی ہے۔ شاید اس سوال کا رہ فطرت جواب نہ دے سکے۔ جو بالکل ہی کر اور گنگ ہو اور جس کی حس بالکل ہی ماری گئی ہو۔ ورنہ ہر فطرت جواب دے سکیگی۔ ہر فطرت یہی جواب دے گی کہ :-

وہ ہر صورت اور ہر حالت میں خواہاں عظمت اور علوّ ہے۔ ہر فطرت یہی چاہتی ہے کہ اگرچہ وہ کیسا ہی درجہ رکھتی ہو۔ دوسروں کے مقابلہ میں اُسے ایک تفوّق اور برتری حاصل ہو۔ یہ ایک طبعی خاصہ اور طبعی میلان ہے۔ اس خاصہ اور میلان سے کوئی خالی نہیں۔ اگرچہ اس کا اظہار مختلف رنگوں میں ہوتا ہے لیکن کوئی ایسی فطرت نہیں جو یہ نہ چاہے۔ فطرت ایک مفتی ہے فطرت ایک جج ہے جب ہر فطرت کا یہ فتوے اور ہر جج کا یہ فیصلہ ہے تو ماننا لبیتا چاہیئے کہ ہر فطرت خواہانِ علوّ اور جویانِ تفوّق ہے۔ ہم اس بحث میں انسانی میلانات کی تقسیم تین درجوں میں کرتے ہیں۔

(الف) معاوی رنگ میں طالبِ تفوّق۔
(ب) معاشری رنگ میں طالبِ تفوّق۔
(ج) آزادانہ رنگ میں طالبِ تفوّق۔

اگرچہ دُنیا میں ایک بڑی حد تک درجہ بندی پائی جاتی ہے۔ اور اس کی ضرورت بھی ہے اور یہ درجہ بندی معادی معاشری اور آزادانہ پہلو سے مرعی ہے۔ مگر از یں ہمہ تفوّق کی خواہش اور ولولہ ہر طبیعت رکھتی ہے اگرچہ اُس کی کیفیت اور مقدار میں کسی حد تک فرق ہو۔ جو روحیں خود کو معاشری امور سے ایک بڑی حد تک آزاد سمجھتی ہیں۔ وہ بھی معادی رنگ میں جویاں تفوّق ہیں۔ معاشری منازل میں رہنے والے بھی پہلو بہ پہلو تفوّق کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ جو لوگ ایک حد تک خود کو آزاد کہتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ ہمیشہ اس دُنیا کی مذمّت سے رطب اللسان رہتے ہیں اُن کی طبائع میں بھی خواہش تفوّق پائی جاتی ہے۔ وہ معصوم بچّے جو ابھی دُنیا کی روشوں اور چالوں سے واقف نہیں ہوتے اُن کی طبائع میں بھی یہ ولولہ موجود ہوتا ہے۔ چار پانچ لڑکے دوڑا کر دیکھئے۔ ہر لڑکا یہی چاہیگا کہ کسی نہ کسی طرح دوسرے سے بڑھکر دکھائے یہ کونسی طاقت ہے جو ہر لڑکے کے دل و دماغ میں دورہ کر رہی ہے یہ وہی خواہشِ تفوّق ہے۔ جو ہر فطرت میں مودّعہ ہے۔ یہ وہی آرزو تو ہے جو ہر طبیعت انسانی کا ورثہ ہے۔ ؎

این شورِ محبّت است ورنہ   بلبل جز مشت پر نہ بود است

یہ تفوّق کیا ہے۔ یہ خواہش برتری کیا ہے؟ وہی خودی اور وہی خودداری جو مثنوی اسرار خودی میں زیر بحث ہے وہی ولولہ اور وہی جوش جو ہر انسانی طبیعت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ وہی طاقت وہی خاصہ جو ہر انسان اپنی پوزیشن اور اپنا درجہ قائم رکھنے میں صرف کرتا ہے۔ وہی غیرت اور وہی حمیّت جو دُنیا میں انسان کے واسطے ایک ذمہ وار کفیل ہے وہی جذبہ جو ایک صنفِ نازک عورت کو باوجود زنگارنگ کی تحریکاتِ اندرونی و بیرونی کے بھی

صاحب عصمت اور ایک سپاہی کو جنگ و جدال میں بہادر بناتا ہے۔ فطرت کیا ہے جو ہر رنگ میں اپنا اظہار چاہتی ہے۔ یہی خودی کا بھی خاصہ ہے۔ خودی انسانی فطرت کا ایک قابل فخر جوہر ہے۔ انسانی فطرت آرزومندِ علّو ہے۔ اور علو خودی کا دوسرا نام ہے۔ درجہ بندی خودی کے مختلف زینوں کا نام ہے۔ اگر خودی نہ ہوتی تو یہ درجہ بندی بھی نہ ہوتی ان درجہ بندیوں کا موجب یہی خودی ہے۔ بادشاہ سے لیکر غلام تک خودی کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔ ہر ہستی خواہانِ علّو اور جویانِ امتیاز ہے جو ہستی یہ نہیں چاہتی وہ ننگ ہستی ہے۔ نہ تو سیاسی قانون اس کا مانع اور نہ شریعت دونوں اس کی تائید میں ہیں۔ قانون معاد اور قانونِ معاشرت دونوں کی اس قبالۂ خودی پر مہر ہے۔ ؎

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است زیر خاک ما شرارِ زندگی است

خودی اور کیریکٹر

عشق کارے است کہ دشوار تر از ہر کار است مشکل این است کہ آساں بہ نظر مے آید

سیرت اور کیریکٹر پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ فلسفۂ مذہب اور فلسفۂ تمدن دونوں میں اس پر بہت کچھ کہا گیا ہے بعض نے یہاں تک کہدیا ہے۔ کہ کیریکٹر اور سیرت ہی سے قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ اور سیرت ہی ایمان ہے۔ تعلیم کا اصلی مدعا سیرت اور کیریکٹر ہی کا بنانا ہے۔ جو تعلیم یہ مدعا نہیں رکھتی وہ ایک طوطا کہانی ہے۔ سیرت بُری بھی ہوتی ہے اور اچھی بھی۔ اخلاق محمود بھی ہیں اور غیر محمود بھی۔ اخلاقِ محمود اور نامحمود کا نام سیرت یا کیریکٹر نہیں ہے سیرت اور کیریکٹر اس خاصہ اور اُس عادت کا نام ہے۔ جو انسان کو ایک بات اور ایک رائے پر مضبوطی کے ساتھ ثابت اور قائم رکھتی ہے۔ اگر ایک شخص ایک مذموم فعل پر صادق اور اپنی ذاتی رائے کے مطابق ثابت قدم اور قائم ہے۔ تو گو وہ ایک بُرے فعل کی پیروی کر رہا ہے لیکن چونکہ اُس پر اب تک اُس کی برائی کھلی نہیں اس واسطے اسکا قائم

اور ثابت قدم رہنا ایک سیرت محمودہ اور ایک کیریکٹر سعیدہ ہے۔ ایسا شخص بمقابلہ اُس شخص کے جو بزدلانہ رنگ میں قسمیں کھانا اور بہانے کرتا ہے۔ ہزار درجے اچھا ہے۔ اگر ایسے صاحب سیرت پر بھی اپنے فعل کی بُرائی کھل گئی تو وہ اُسی حوصلہ اور ہمت سے چھوڑیگا۔ جس ہمت اور جس حوصلہ سے وہ قبول کر چکا تھا۔

خودی اور خودداری کی بھی یہی صفت ہے خوددار شطرنج کا مہرہ نہیں ہوتا کہ کبھی کسی خانہ میں جائے۔ اور کبھی کسی خانہ میں۔ وہ سیماب کی طبیعت نہیں رکھتا۔ وہ تر بوز نہیں ہوتا۔ کہ صفرا سے مل کر صفرا بن گیا۔ اور سودا کے ساتھ سودا۔ وہ الماس ہوتا ہے نہ کہ شبنم وہ قائم مزاج ہوتا ہے نہ کہ سیماب مزاج وہ خود کو مختلف حالات میں قائم رکھتا ہے۔ اُس کے مزاج میں ایک قسم کی استواری اور محکمیت ہوتی ہے۔ وہ اُن جذبات اور اُن قوتوں کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو قدرت نے اُسے دے رکھی ہیں۔ قانون کی اس واسطے تعریف اور فرمانبرداری نہیں کرتا کہ قانون بحیثیت ایک قانون کے اُسے حکم دیتا یا اُسے مجبور کرتا ہے۔ بلکہ اس حیثیت سے کہ قانون واقعی قابل اتباع ہے۔ وہ گورنمنٹ کی صرف اسواسطے اطاعت کرتا ہے کہ اُس پر ایسی اطاعت واجب ہے۔ نہ اس واسطے کہ وہ گورنمنٹ سے کچھ حاصل کر کے رہیگا۔ اور اُس کی اطاعت سیاسی رنگ میں اُسے محفوظ رکھیگی۔ سیرت اور کیریکٹر کی یہی بڑی بڑی شرطیں ہیں۔ اور ان ہی شرطوں پر اُس کی عظیم الشان اور روشن ہستی کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ سیرت اور کیریکٹر کی جامع مانع اور صحیح تعریف کیا ہے تو میں آزادی سے کہوں گا۔ کہ

"خودی اور خودداری"

یہ ایک ایسی تعریف ہے کہ اس سے زیادہ اور کوئی ہو نہیں سکتی۔ اس میں وہ جامعیت اور مانعیت ہے کہ اور الفاظ اس کے حامل ہو نہیں سکتے۔ جب ہم یہ سمجھنے لگیں گے کہ سیرت اور کیریکٹر بھی خودی اور خودداری ہی کا نام ہے۔ تو اُس وقت ہم میں سیرت اور کیریکٹر کی جو

کمزوریاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں بالکل اڑ جائینگی

دیکھو ایک شخص صرف اس واسطے گورنمنٹ وقت کی فرمانبرداری اور اطاعت کرتا ہے۔ کہ اُس پر بہ حیثیت رعایا ہونے کے یہ فرض ہے اور دوسرا اس خیال یا اس لالچ سے کہ وہ اس اطاعت سے کبھی بعض امتیازات سے ممتاز ہوگا۔ کیا ان دونوں میں کوئی فرق نہیں کیا یہ دونوں اطاعتیں ایک ہی قیمت رکھتی ہیں۔ ان دونوں میں روپیہ اور کھوٹے پیسہ کا فرق ہے۔

باغیر سرے داری وگوئی کہ ندارم پنہاں نظرے داری وگوئی کہ ندارم

پہلی قسم کی اطاعت سیرت اور کیریکٹر صحیحہ کا ثبوت عملی ہے۔ اور دوسری قسم کی فرمانبرداری حریصانہ۔ بزدلانہ اور طماعانہ روش۔ پہلی قسم کی سیرت خودی اور خودداری کی آغوش میں پرورش یافتہ ہے اور دوسری قسم کی سیرت گربہ سیرت ہے۔ اس میں نہ تو صداقت ہے۔ اور نہ مضبوطی۔ اُمید ٹوٹنے کے ساتھ ہی اسکا رشتہ بھی ٹوٹ جائیگا پہلی قسم کی سیرت باوجود انواع واقسام کی مایوسیوں کے بھی قائم اور ثابت رہیگی۔

اسی طرح دیگر تمدنی معاملات دوستی و محبت کے سلسلوں میں وہی سیرت کام دیسکتی ہے۔ اُسی سیرت پر فخر کیا جاسکتا ہے جو خودی اور خودداری کی مصاحبت میں پھلی پھولی ہو کہتے ہیں دُنیا میں دوست ملنا مشکل ہے۔ بالکل سچ لیکن کبھی ہم نے یہ بھی سوچا کہ صادق دوست کی شناخت کیا ہے؟

بعض لوگوں نے کہا ہے:۔

"جو مصیبت میں کام آئے"

"جو درد میں راحت ثابت ہو"

"جو وقت پر گریز نہ کرے"

"جو دوست کا درد اور مصیبت اپنی سمجھے"

"جو غدّار نہ ہو"

یہ سب کچھ درست لیکن یہ اوصاف اور یہ باتیں کن انسانوں یا کن احباب میں پائی جاسکتی ہیں۔ جو:۔

"خودی رکھتے ہوں"

"خوددار ہوں"

جو شخص خودی نہیں رکھتا خوددار نہیں اپنی حفاظت خود نہیں کرسکتا۔ وہ دوست صادق کس طرح ہوسکتا ہے۔ صادق دوست وہی ہوسکتا ہے جو خودی رکھتا ہے اور خوددار ہو جسے اپنے جسم و جان ہی کی خبر اور پرواہ نہیں وہ دوسروں کی کیا کچھ حفاظت اور پرواہ کرسکتا ہے۔ انتخاب احباب کے واسطے بڑا بھاری اور اہم اصول یہ ہونا چاہیئے کہ:۔

ایسا شخص خودی پرست اور خوددار ہو۔

جس شخص میں یہ وصف نہ ہو وہ عارضی رفیق تو ہوسکتا ہے۔ دوست نہیں ہوسکتا رفاقت میں اکثر اوقات عارضی رفاقت مطلوب ہوتی ہے۔ لیکن دوستی میں دوست داری کی ضرورت ہے۔ اور دوست داری سوائے اس کے ہوتی نہیں کہ دوسرا خودی رکھتا ہو اور خوددار ہو۔

جو اپنی مدد آپ نہیں کرسکتا جو خود کو منہیات زمانہ اور مکروہات زندگی سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ جو اپنی قدر آپ نہیں جانتا جو قطرہ شبنم کی طرح تھوڑی سی حدت کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا جو ہر مجلس اور ہر محفل میں ناطقہ فروش اور سیرت کا سودا کرتا پھرتا ہو اور اپنی قیمت دن بھر میں پچاس دفعہ بدلتا ہے۔ جسے اپنے قول و فعل کا کوئی لحاظ ہی نہیں جو ثقل مجلس ہے۔ جس کی بات کوئی وزن ہی نہیں رکھتی۔ جو خود کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ جو اپنی عزت آپ کرنے کے فلسفہ سے محض ناآشنا ہے۔ جو چوراہے کا پتھر ہے جو گرگٹ کی طرح ہر وقت رنگ بدلتا رہتا ہے کبھی اعتبار اور دوستی کے قابل ہوسکتا ہے؟ زندگی کی آبرو اور عزت مضبوطی اور صلابت ہی میں ہے۔ ریشہ خطمی نہ بنو شبنم نہ بنو ہار روئی نہ بنو۔ الماس بنو۔ یاقوت بنو لعل بنو

یہ نہیں بن سکتے تو آہن اور پتھر ہی بنو۔

در صلابت آبروئے زندگی است　　ناتوانی ناکسی ناپختگی است

صلابت کب ہوتی ہے جب سیرت پختہ اور کیریکٹر صحیح ہو۔ سیرت پختہ اور کیریکٹر صحیح کب ہوتا ہے جب خودی اور خودداری ہو۔ خودی اور خودداری کب ہوتی ہے۔ جب ہمیں اپنی قدر و عزت آپ ہو۔ اور ہم خود کو سمجھنے لگیں۔ اپنی سمجھ کب آتی ہے۔ جب قوتوں اور جذبات کا استعمال صحیح طور پر ہو۔ یہ مرحلہ کب طے ہوتا ہے جب اپنے ماحول اور اپنے کرّہ کی ضروریات اور کیفیات سے واقفیت ہو۔ یہ واقفیت کب ہوتی ہے۔ جب بہ مصداق آیت کریمہ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ماحول اور مناظر اردگرد کا مشاہدہ کیا جاوے۔ سفر سے مراد صرف سفر ہی نہیں بلکہ مناظر ماحول کا غور اور مشاہدہ بھی

گلگوں اشک گرم عنانی مرا بس است　　شوقِ بکوئے دوست رسانی مرا بس است

(خودی کے متعلق مغالطہ)

جس طرح اور انسانی اجتہادات میں غلطیاں ہو جاتی ہیں اسی طرح فلسفہ خودی کے سمجھنے میں بھی چند در چند غلطیاں ہو رہی ہیں یا اُس کی تاویل اور تعبیر میں مغالطے سدِّ صحت ہو رہے ہیں۔ خودی علم النفس کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ جس شخص نے اس کا باقاعدہ مطالعہ کرنے سے پیشتر اسپر توجہ نہ کی ہو وہ پورے طور پر نہیں سمجھ سکتا کہ اس جذبہ کی ماہیّت کیا ہے۔ اور اس کا عمل کن کن شرطوں کے تابع ہے۔ جن لوگوں نے اسپر غور کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی اُن کے نزدیک یہ جذبہ اوّل ترین جذبات میں سے ہے۔ اگر انہیں مزید غور کا موقعہ ملتا تو وہ سمجھ جاتے کہ جسے ہم ذلیل ترین جذبہ سے منسوب کرتے ہیں وہی ہماری شرافت کرامت اور صحیح زندگی کا کفیل اور دلیل ہے۔ بعض شاعروں۔ ناظموں۔ اور بعض سطح بیں لوگوں کے نزدیک خودی اور خودداری ایسا شریف اور ممتاز جذبہ عالِ انسانیت

اور ننگ روّیۂ اخلاق ہے۔اِس قسم کے حواشی اور حجب سے خودی کے خوش آیند خوشنما جذاب چہرہ پر ایسا پردہ پڑ گیا ہے۔کہ اُس کی اصلی حقیقت لطالت اور ظلمت سے تبدیل ہو گئی ہے۔

بے نوا ساختہ این عشق جگر خوار مرا — برگ عیشم دوستہ لخت جگرے بود نماند

اکثر مشاہیرِ اسلام نے اپنے اپنے رنگ میں فلسفہ خودی اور خودداری کی بحث اور تبلیغ کی ہے۔اور اُسے انسان کی معادی اور معاشری ترقیات کا ایک جزو اعظم مانا ہے باوجود اس کے بھی بعض غلط حواشی اور حقیقت کُش حجب کی وجہ سے خودی اور خودداری کی غلط تاویلیں کی جاتی رہیں۔جن کے اثر سے بلند خیالی پست خیالی سے بدل گئی۔ہمتیں پست پڑتی گئیں۔فطرتیں کمزور ہوتی گئیں۔اخلاق مُردہ ہوتے گئے۔ثابت قدمی بزدلی سے بدل گئی۔خودی اور خودداری کے نام سے نفرت بڑھتی گئی۔مشروع اور جائز حسّیات کا ماردینا یا کھودینا تزکیہ نفس سمجھا گیا۔اور اخلاق کا ایک جزو اعظم۔

خودی اور خودداری کی بدولت جو عزّ و وقار۔جو اعتبار جو احترام اور جو امتیاز حاصل تھا۔ وہ سب رفتہ رفتہ جاتا رہا۔

رفتی و نقش پائے تو دیدم گریستم — نام ترا زہر کہ شنیدم گریستم

اِس مردہ فلسفہ اور اس باز رفتہ دولت اور اس بوسیدہ سرمایہ کے حاصل کرنے اور پھر عدم سے وجود میں اور ظلمت سے روشنی میں لانے کے واسطے حضرت اقبال بالقابہ نے مثنوی مندرجہ عنوان فارسی زبان میں لکھی ہے۔جس میں اَسرار خودی۔اَسرار اعتماد نفس۔ اَسرار زندگی۔اَسرار سیرت۔اَسرار خودسازی اور اَسرار حسّیات۔انفرادی رنگ میں اس خوبی اس متانت اور اس جامعیت سے ایک مؤثرانہ پیرایہ میں دکھائے ہیں۔کہ جن پر غور کرنے سے پتہ لگ سکتا ہے کہ

"اصل انسانیت اور شرف انسانیت کیا ہے"؟

"زندگی کیا ہے۔ اور اُس کا تعلق کن کن برسج ہستیدہ سے ہے"؟
"ہم کس طرح زندہ رہ سکتے ہیں"؟
"ہمیں کس طرح زندہ رہنا چاہیئے"۔
"اعلےٰ سیرت کیا ہے"۔

مقاصدِ مثنوی

بہ پیرایۂ خودی اس مثنوی میں مقاصد ذیل پر بحث کی گئی ہے۔

(۱) تمہیدی مراحل (۲) نظامِ عالم خودی پر موقوف ہے (۳) خودی تعیّنات وجودیہ کی مستلزم ہے (۴) حیاتِ خودی تخلیق اور تولید مقاصد سے وابستہ ہے (۵) خودی عشق ومحبت سے استحکام پاتی ہے۔ (۶) خودی سوال سے ضعیف ہوتی ہے (۷) استحکام خودی از عشق ومحبت موجب تسخیر قوائے ظاہریہ ومخفیہ نظام عالم ہے (۸) مسئلہ نفی خودی مخترعات اقوام مغلوبہ میں سے ہے (۹) اجتہادات وتخیّلات افلاطون منافی فلسفہ خودی ہیں (۱۰) خودی کے تین مراحل ہیں۔ (الف) اطاعت (ب) ضبط نفس (ج) نیابت الٰہی (۱۱) اسمائے حضرت علی علیہ السلام سے خودی پر استدلال (۱۲) حکایت نوجوان سے خودی کا استدلال (۱۳) حکایت طائر سے خودی کا استدلال (۱۴) استدلال از الماس وزغال (۱۵) حیات ملّیہ تمسک روایات مخصوصہ ملّیہ پر موقوف ہے۔ بہ پیرایہ حکایت شیخ وبرہمن (۱۶) اعلائے کلمۃ اللہ مقصد حیات مسلم ہے۔ باقی زوائد یا حواشی (۱۷) ارشادات بابائے صحرائی سے خودی پر استدلال (۱۸) تصرفات روزگار۔ بہ عنوان وقت بھی ایک سیف ہے (۱۹) دعا۔

اِن مختصرانہ مقاصد سے سوچنے والے سوچ سکتے ہیں۔ کہ اسرارِ خودی کی حقیقت اور اُن کا انکشاف کس وضاحت اور کس جامعیت سے کیا گیا ہے۔ ہر عنوان پر کیا ہر شعر پر

ایک بسوط کتاب لکھی جاسکتی ہے حضرت اقبال نے جس متانت اور جس سلاست سے رازخودی کے چہرہ سے نقاب اٹھائی ہے۔ وہ سفارشی ہے کہ ہر طالب منزلت روحانی اور شائق وجاہت انسانی اور ہر عاشق امتیاز وجدانی عملی رنگ میں رونمائی کرکے اُس سے مستفیض اور مستنیر ہو۔ قوم اور افراد قوم شکرگذاری کے ساتھ اُس پر غور کریں۔ اور اُس فریب تخیل سے بچیں جو خودی اور خودداری کی مذمت اور ذلت پر زور دیتا ہے۔ ہم بمراحل تمدنیہ اُسی صورت میں قائم اور زندہ رہ سکتے ہیں۔ جب خودی اور خودداری ہمارا ردیہ ہو۔

واقف قدرے عشق بیاموز بیاموز　　خوب است کہ آدم ہنرے داشتہ باشد

حضرت اقبال ایک درد بھرے دل سے اشعار ذیل میں شاکی ہیں کہ ابنائے ملت ارکان مذہب فلسفہ خودی اور اُس کی عظمت وضرورت سے اسقدر غافل ہو چکے ہیں کہ اُن کے نزدیک اُس کا نام لینا بھی خود کو پایہ اخلاق سے گرانا ہے۔

بسکہ عود فطرتم نادر نوا ست　　ہم نشیں از نغمہ ام ناآشنا است
عصر من دانندۂ اسرار نیست　　یوسف من بہر ایں بازار نیست
نغمۂ من از جہانِ دیگر است　　ایں جرس را کاروان دیگر است
برقہا خوابیدہ در جانِ من است　　کوہ وصحرا باب جولانِ من است
ہیچ کس رازے کہ من گویم نگفت　　ہم چو فکر من دُرِ معنے نہ سفت

ایک ایک شعر ایک ایک مصرعہ زبانِ حال سے ایک جامع تفسیر اور سلسل تفصیل کا سفارشی ہے۔ الفاظ کم ہیں معانی بے انداز حروف تھوڑے مقاصد بے انتہا اور تمیز بے بہا جن مضامین عالیہ کا قلم اقبال نغمہ سرا ہے اور جن جذبات محترمہ کے عملی رنگ میں لانے اور زندہ رکھنے پر زور دیا گیا ہے۔ اگر اُن کا وعظ ممالک یا اقوام مغربی خصوصاً سرزمین انگلستان میں ہوتا تو شاید مثنوی اسرار خودی کے ایک ہی ہفتہ میں بیسیوں ایڈیشن نکلتے اور حضرت اقبال کا لٹریری اقبال مُلک بھر میں اپنی نظیر نہ رکھتا۔

بجائے اس کے یہاں ایسے جذبات شریفہ کا انتزاع اور انحطاط انفرادی اور اجتماعی زندگی کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ وہ بلند خیالیاں وہ ارتقائی صورتیں جو اس جذبہ خودی کے عشرات اور ذرّیات ہیں۔ انسانیت اور شرف انسانیت کے منافی سمجھی جاتی ہیں۔ وہ خودی جو امتیازات انسانی کا طرۂ زیبا اور دعوئے تنازع للبقار کی برہان قاطع تھی۔ خوش فہمی یا بدقسمتی سے آج عارِ انسانیت ننگ آدمیت سمجھی جاتی ہے۔

مشغول بہ بازی است حال سلسلۂ زلف ۔۔۔ دیوانہ دل من بچہ کار است بہ بینید!

ابنائے ملت خودی مارتے مارتے خودداری۔ خود حفاظتی۔ خود غیرتی۔ خود سازی۔ خود ضبطی بھی کھو بیٹھے۔ ادھر یہ خودکشی اور ادھر قرآن مجید یوں کہتا ہے۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ

اس آیت میں فائق رہنے اور علو کی شرط مومن ہونا ہے۔ مومن کون ہے جو ایماندار ہے۔ ایمان کیا ہے ایک مرکز پر قائم رہنا اگرچہ کیسی ہی مایوسیوں اور کلفتوں کی نوبت پہنچے یہ کیا ہے۔ ایک خودی اور خودداری

اسی تبلیغ اور تعلیم قرآنی سے متاثر ہو کر حضرت اقبال فرماتے ہیں۔

برگرفتم پردہ از راز خودی ۔۔۔ وانمودم سرِّ اعجاز خودی

پیکر ہستی ز آثار خودی است ۔۔۔ ہرچہ مے بینی ز اسرار خودی است

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد ۔۔۔ آشکارا عالم پندار کرد

یہ مختلف نظارے بوقلموں کائنات کیا ہے۔ یہ ہمارے بنانے والے خدا کی خودی کا تماشا اور اظہار ہے۔ ہم کیا ہیں خدائی خودی کا ایک عظیم الشان اور زندہ ثبوت۔ ایک خوش آیند مظہر اور ایک اٹل شہادت۔ بہ قول حضرت اقبال۔

ذاتِ ما آئینۂ ذاتِ حق است ۔۔۔ ہستیٔ مسلم ز آیات خود است

ذرا دلچسپی اور غور سے یہ شعر پڑھئے۔ اور پھر کہئے کہ اس میں حضرت اقبال نے کس

خوبصورتی اور کس جامعیت سے قرآنی فلسفہ بیان کیا جاتا ہے ظہور مسلم ظہور محمدؐ ہے اور ظہور محمدی ظہور خدا۔ ظہور محمدی سے ظہور خدائی وابستہ ہے۔ اور اگر صاف صاف الفاظ پوچھو تو اگر ظہور محمدی نہ ہوتا تو دنیا میں اس آب و تاب سے ظہور خدا بھی نہ ہوتا۔

"تو خدا نہ ولیکن بہ خدا ہمے رسانی"۔

ہم اس وقت یا تو تعظیم اصنام میں جھکے ہوتے اور یا ہیبت سے خدا ہمارے گلے کا ہار ہوتے۔ یہ محمدؐ ہی کی طفیل اور برکت ہے کہ ہم اس وقت ایک واحد خدا کے پرستار ہیں محمدؐ کے ظہور سے خدا کی خودی ظہور پذیر ہوئی۔ وہ خودی جو مدتوں تک انسانی شرک و ارتداد کے غشا میں مستور تھی۔ محمدؐ نے ہمیں عبادت اور معاملات کے رنگ میں کیا سکھایا۔ اور ہم نے اُس ذاتِ مقدس سے کیا سیکھا؟

موحدانہ رنگ میں خودداری۔ خودسازی۔ خود احتسابی۔ خود ضبطی اور خود غیرتی۔ گو عرصہ ہوا کہ ہم ان اوصاف سے دُور جا پڑے ہیں لیکن سوچنے سے یہ پتہ لگ سکتا ہے کہ تعلیم محمدیؐ کا لب لباب اور خلاصہ یہی تھا۔ خودداری خودداری خودداری!!!

سر بہ سودائے تو دارم کہ تجارت این است شغل عشق تو گزیدم کہ فراغت این است

حضرت اقبال کا یہ بیان محض اجتہادی نہیں اس پر قرآن مجید بھی بر رنگ خود شاہد ہے دیکھو قرآن مجید کس پیرایہ سے عالم و عالمیان کو خودی اور خودداری۔ خود نمائی۔ خودسازی کی تبلیغ کرتا ہے۔

"اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" الخ "وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا" الخ
"وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ" الخ "اَلْعِزَّةُ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ" الخ
"كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ"

اللہ جل شانہٗ انسان کو زمین پر اپنا نائب بناتا اور اُس سر نیابت پر متمکن کرتا ہے جو فرشتوں کو بھی نصیب نہ ہوا اور اسی پر بس نہیں۔ فرشتوں کو یہ بھی حکم ہوتا ہے۔ کہ

حضرت آدم کو سجدہ کرو۔ یہ تعظیمی سجدہ صرف حضرت آدم علیہ السلام ہی کے لئے نہ تھا۔ اُس کی ذریات بھی بہ سلسلہ وراثت آبائی اِس میں درجہ بدرجہ حصہ دار ہے۔

کیا یہ حوصلہ افزائی اور نوازش عملی رنگ میں ثابت نہیں کرتی کہ حضرت انسان کو یہ خاص احترام اور قابلِ فخر عزت دیکر سمجھایا گیا ہے۔ کہ کائنات میں اُس کی یہ قدر و منزلت اور یہ درجہ ہے۔ یہ احترام و اکرام کیا تھا؟ اُسی خودی کی نمائش اور عملی رنگ میں اعتراف جو فطرت انسانی میں مودعہ ہے۔ اور جس کی تفسیر حضرت اقبال کی یہ مثنوی ہے۔ یہی پردہ راز تھا جو بہ یوم میثاق اُٹھایا گیا تھا۔ یہی اسرار خودی ہیں جو فرشتوں نے جبین نیاز سے کھولے تھے۔ یہ وہی بیداری ہے جس کا اشارہ حضرت اقبال نے اس شعر میں کیا ہے۔

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد　　آشکار اعالم پندار کرد

آفتاب مایۂ پندار جو انسان کی زندگی ہے۔ فرشتوں کی جبیں سائی سے درخشاں اور آشکارا کیا گیا اور اُن سے بایں رنگ اس کا اعتراف کرایا گیا۔ اور حضرت انسان کو سمجھایا گیا کہ خودی۔ خود سازی۔ پندار ہی سے تم زندہ کہلا سکتے ہو۔ خودی اور خودداری ہی تمہاری زندگی کا اعلےٰ جزو اور خاص نشان ہے۔ حضرت اقبال فرماتے ہیں ؎

وا نمودن خویش را خوئے خودی است　　خفتہ در ہر ذرّہ نیروئے خودی است

چوں حیات عالم از زور خودی است　　پس بقدر استواری زندگی است

زندگی محکم ز ایقاض خودی است　　کاہدا از خواب خودی نیروئے زیست

خواب بے خودی اور مدہوشی ہے۔ بیداری خودی اور ہوش ہے جس طرح انسان خواب اور بے ہوشی میں عالم و عالمیان کے حالات اور کیفیات سے بے خبر ہوتا ہے۔ اسی طرح بے خودی میں بھی انسان اُن مراحل اُن کیفیات سے لاعلم اور بے خبر رہتا ہے جو خودی اور خودداری کا اندوختہ اور اثر حسنہ ہے۔ فلسفہ خودی سکھاتا ہے کہ اگر تنازع للبقاء کے ماتحت زندہ رہنا چاہتے ہو تو مامونہ اور مشروطہ خودی زندہ رکھو اور اس سے کام لو۔

کیونکہ زندگی کا جزو اعظم یہی خودی ہے۔ تُم نائبِ خدا ہو تمہیں خلافت کا منصب دیا گیا ہے۔ تمہارے سر پر طرۂ توحید اور تاجِ خلافت رکھا گیا ہے۔ تمہارا پندار ان امانتوں کا کفیل ہے۔ خدا نے تمہیں اُن چیزوں اُن فضائل کا حصہ دار بنایا جن کا خود ہی اہل تھا۔ اور جو اُسی کی ذاتِ صمدی سے مخصوص تھیں۔ اگر تمہیں پاسِ خودی اور خودداری نہیں اور تم اعتماد نفس نہیں رکھتے تو تم کچھ بھی نہیں یہ تمہاری انانیت ہی کی عظمت اور شان ہے۔ کہ تمہیں اوروں کے مقابلہ میں اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے۔

دُنیا کے تمام پندار تمہارے عظیم الشان پندار کے مقابلہ میں ہیچ اور لاشے ہیں۔ دیکھو تمہیں کس وضاحت سے کہا گیا ہے۔

وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَائِمٍ

تمہیں اس خودی کی بدولت وہ دولتِ زندگی دی گئی ہے جو انتقالِ روح پر بھی کھوئی نہیں جاتی جس طرح خودی کی بدولت ہر شے ثابت اور قائم رہتی ہے اسی طرح تمہاری ذات بھی قائم رہیگی۔ یہ خودی ہی ہوگی جو تمہیں یومِ حشر میں خدا کے دربار میں کھڑا کریگی۔ یہ خودی ہی کا اثر ہے کہ تمہیں مرنے کے بعد بھی زندہ کیا جائیگا چونکہ خدا خود قائم اور حی ہے۔ اِس واسطے خدا نے تمہیں بھی زندہ اور حی رہنے کا فخر بخشا۔ خودی اور خودداری مختلف خواہشات اور مدعاؤں کا سرچشمہ ہے۔ جو دل کوئی مدعا کوئی آرزو جائز خودی کے ماتحت نہیں رکھتا وہ بھی کوئی دل ہے جس دماغ میں کوئی باعظمت خیال متموج نہیں ہوتا وہ دماغ دماغِ بزِ اخفش سے بھی زیادہ تر ہیچ اور بودا ہے۔ ؎

ان شوخ حسینوں پہ جو مائل نہیں ہوتا کچھ اور بلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا

آرزو کا پیدا ہونا اور پندار کا احساس اور ایقاض ہی خودی اور خودداری ہے چاہے وہ آرزو اور پندار کسی قسم کا ہو کیا جو لوگ بزدلانہ رنگ میں خودی رکھتے ہیں

اُن کی طبیعت آرزو سے خالی ہو جاتی ہے یا واقعی اُن کا پندار مر جاتا ہے۔ نہ تو آرزو کا خاتمہ ہوتا ہے اور نہ پندار کو موت آتی ہے۔ ایک قسم کی خودکشی کے ذریعہ سے جذبات اور قوتوں کو رائگاں کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ خودی مار دی گئی۔ اِس سلسلہ میں حضرت اقبال فرماتے ہیں ؎

زندگانی را بقا از مدعا است — کاروانش را درا از مدعا است
چوں ز تخلیق تمنا باز ماند — شہپرش شکست و از پرواز ماند
آرزو ہنگامہ آرائے خودی — موج بے تابی ز دریائے خودی
آرزو صید مقاصد را کمند — دفتر افعال را شیرازہ بند
زندہ را نفیِ تمنا مردہ کرد — شعلہ را نقصان سوز افسردہ کرد
زندگی سرمایہ دار آرزو است — عقل از زاہیدگانِ بطنِ اوست
اے ز راز زندگی بیگانہ خیز — از شرابِ مقصد مستانہ خیز
ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم — از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

ان اشعار میں اُس مستحکم ارادہ۔ عزم۔ ثابت قدمی اولوالعزمی مگر مجوشی کا اعادہ کیا گیا ہے۔ جو خودی اور خودداری کا ثمرہ ہیں جن کے بغیر انسانیت حیوانیت سے بھی پست ہو جاتی ہے۔ کیا کوئی ایک منٹ کے لئے بھی یہ خیال کر سکتا ہے کہ بغیر کسی مدعا کے (عام اس سے کہ اُس مدعا کی نوعیت کیسی ہی ہو) اور بغیر کسی تمنا اور مطمح نظر کے (عام اس سے کہ وہ کسی نقطہ خیال کے ماتحت ہو) انسان کی زندگی ایک بیدار زندگی کہی جا سکتی ہے جبتک انسان کے دل و دماغ میں ہجوم خیالات اور ہجوم مقاصد نہ ہو اور جبتک اُن خیالات میں جوش اور اُن مقاصد میں بلند خیالی اور تحفظ نہ ہو تب تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کوئی زندگی بیداری رکھی ہے۔ جس شخصیت جس مقام کا زندہ ہونے کی حالت میں کوئی مدعا اور کوئی تمنا نہ ہو جسکی آتش آرزو بجھ چکی ہو جس کی شمع مدعا

مدہم پڑ گئی ہو وہ شخصیت اور وہ قوم مردہ ہو چکی اُس کی حسّیں ماری گئیں اُس میں سے وہ نور وہ جوت نکل گئی جو اُس کی طاقت۔ قوت اور روشن ضمیری کا موجب تھی۔

برنگ فلسفیانہ بالفاظ عامہ خودی اور خودداری سے کیا مراد ہے؟

ہر شخص، ہر قوم یہ سمجھے۔کہ :-

"میں بھی دُنیا میں ہوں میرا بھی کوئی وجود ہے"

"مجھے بھی زندہ رہنا چاہیئے"

"میری بھی کوئی شخصیت اور کوئی قومیت ہے"

"میرا بھی کوئی فرض اور کوئی مدعا ہے"

"خودی اور خودداری کا جذبہ میرے دل ودماغ میں مودع ہی نہیں بلکہ میری ذات کا ایک جزو لاینفک ہے۔

جب میں ایسا سمجھتا ہوں اور میرا ایسا سمجھنا ناموزوں اور نادرست ہیں۔ تو میرا فرض ہے کہ :-

"واقعات عالم پر نظر کروں"

"نوعیتِ واقعات پر میرا عبور ہو"

"مشاہدہ اور تجربہ سے کام لوں"

"جو میرا درجہ ہے اُس کے قائم رکھنے کی کوشش کروں"

"شخصی اور ملّی انفرادی اور اجتماعی امتیازات کے قائم رکھنے کی کوشش میں رہوں"

اِس قسم کے احساسات کے بعد ہمارے دل میں کسی قسم کے خیالات متموّج ہو سکتے ہیں اغلباً حسب ذیل :-

"اگر میں کوئی زندگی رکھتا ہوں تو وہ کیسی ہونی چاہیئے (۱) جدو باوقار (۲) باغیرت ہو (۳) بااثر ہو (۴) باامتیاز ہو (۵) بانشان ہو (۶) بالاعتبار ہو (۷) مامون ہو

یہ سب باتیں شجرِ خودی اور خودداری کا ثمرہ ہیں۔ اگر ہم خودی نہیں رکھتے تو یہ ثمراتِ خودی بھی نہیں مِل سکتے۔ ایک حدیث میں آیا ہے "قیامت کے دن مسلمانوں سے مندرجۂ ذیل باتوں کی نسبت سوال ہوگا"۔

(۱) عمر کے دن کس طرح صرف ہوئے (۲) شباب کے دن کیسے گذرے (۳) مال کیونکر حاصل کیا (۴) نوعیت صرفِ مال کیا تھی (۵) صحت یا غلطی کے معلوم ہونے پر کیا عمل کیا۔

یہ ہر پانچ استفسارات کیا ہیں۔ مخزنِ خودی۔ معیارِ خودداری ضابطۂ خود ضبطی قانونِ خودسازی۔ مسلک خود حفاظتی۔ اصولِ شخصیت طریقِ تعینِ ذات۔

زندگی کا پہلا اصول کیا ہے یہ کہ میں خود کو زندہ سمجھوں۔ اور اپنی پوزیشن باعتبار تنازع للبقاء مجھ سے مخفی نہ ہو۔ کیا ہم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ فرشتوں نے ہمیں کیوں سجدہ کیا یا رب العالمین نے اُن سے کیوں سجدہ کرایا۔ اور اُس کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو ہم سے پہلے تھے صرف اس بات کے ثابت کرنے کے واسطے کہ (آخر آمد بُود فخرِ اولیٰں)

اسی ضمن میں حضرت اقبال فرماتے ہیں۔

ہر کہ دانائے مقاماتِ خودی است — فضلِ حق داند اگر دشمن قوی است
خویش را چوں از خودی محکم کنی — تو اگر خواہی جہاں برہم کنی
گر فنا خواہی ز خود آزاد شو — گر بقا خواہی بہ خود آباد شو
چیست مردن از خودی غافل شدن — تو چہ پنداری فراقِ جان و تن
در خودی کن صورتِ یوسف خرام — از اسیری تا شہنشاہی خرام
از خودی اندیش مردِ کار شو — مردِ حق شو حاملِ اسرار شو
شرح رازاز داستانہا مے کنم — غنچہ از زورِ نفس وا مے کنم

ذرا غور سے اِن اشعار کو پڑھ کر اپنے دل میں سوچو کہ طائرِ ذہنِ اقبال کن فضا میں حمید اور کن اخلاقِ سعیدہ کے خوش آیند فضا میں پرواز کر رہا ہے۔ واقعی جو شخص مقامات و مراتب

خودی سے آگاہ ہے۔ اور خودی کی استحکامی راہوں سے واقف ہے۔ وہ اگرچہ مہام سعادی
اور مراحل معاشری میں ناکامیاب بھی ہو پھر بھی اس کی ہمت اور اُس کے ارادہ میں ایک
استقامت اور شجاعت پائی جاویگی۔ حامل اسرارِ مناظرِ قدرت وہی شخص ہو سکتا ہے جو اپنی
ذات میں ایک ہمت ایک استقلال رکھتا ہو ہمت اور استقلال دوسرے الفاظ میں خودی
ہے۔ ایک حکیم۔ ایک فلاسفر۔ ایک سیاح۔ ایک دستاد مہمات علمیہ اور مراحل تجربیہ میں بار بار
شکست کھاتا اور ہزیمت اُٹھاتا ہے۔ اور بااین ہمہ اُس کی ہمت اور استقلال میں فرق
نہیں آتا۔ اگر یہ تماشا خودی اور خودداری کا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اس مثنوی میں
حضرت اقبال جو داستانِ خودی اور رازِ خودداری کی گرہیں کھول رہے ہیں یہ خود خودی
ہی تو کھلوا رہی ہے۔ جب خودی نے دیکھا کہ اُس کا خون ہوا جاتا اور اُس کی مبارک ہستی مٹنے
کو ہے تو وہ بزبانِ اقبال یوں گویا ہوئی سے

شرح رازاز داستانہا مے کنم   غنچہ از زورِ نفس وا مے کنم

دیکھو خودی اپنے منہ سے بول کر بے خود اور مدہوش ہستیوں کا ناطقہ بند کر رہی ہے
انانیت نے آخر اقبالی رنگ میں کروٹ لی۔ سرِ خودی خود بخود جوشِ انانیت میں خدا خدا کر کے
کھل گیا۔ خودی کی مہا دیوی بولی بھی تو اقبال کے مُنہ سے بولی۔ ع

قرعہ بھی پڑا دیکھو تو اقبال پر جا کر

ہمیں حضرت اقبال سے ملنے کا مدت ہوئی کہ موقعہ نہیں ملا اُن سے اگر کوئی پوچھیگا
تو اُنہیں کہنا پڑیگا کہ مطالبِ مثنوی اور مقاصدِ خودی یا اسرارِ خودی اُنکے منہ چڑھ بولے ہیں۔
رسول کریمؐ نے فرمایا ہے اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانَ

حیا کیا ہے دوسرے رنگ میں کرشمہ خودی۔ عشوہ خودداری۔ نغمہ خود ضبطی۔ سرودِ
خودسازی ہے خودی اور خودداری بخشتی کیا ہے؟ آبرو۔ وقار۔ غیرت۔ امتیاز۔ حسیاتِ شخصیہ
حسیاتِ ملیہ۔ حسیاتِ دائمی جس قوم اور جس خاندان میں حسِ خودی اور خودداری صحیح رنگ

میں ہوتی ہے۔ وہ خاندان اور وہ کنبہ کبھی فنا نہیں ہوتا۔ جو قوم صحیح معنوں میں خودی اور خودداری رکھتی ہے وہ بھی کبھی نہیں مرتی۔ لوگوں نے غلطی سے زندگی کے معنے نہیں سمجھے موت ہر ایک پر آویگی۔ لیکن وہ زندگی جو دائمی ہے۔ اور جو خودی کے قالب میں ملتی ہے۔ کبھی موت کا اثر قبول نہیں کرتی۔ مسلمانوں کو کہا گیا ہے کہ انہیں دوسری زندگی بھی ملیگی وہ مرتے نہیں ہیں بلکہ ایک درمیانی فاصلہ طے کرتے اور ایک مقررہ عرصہ تک عرصۂ زندگی سے غیر حاضر رہتے ہیں۔ ہمیں دوسری زندگی کس ذریعہ سے ملیگی۔ تزکیۂ خودی اور قیامِ خودداری سے یہ عبادت اور زہد و ریاضت کیا ہے؟ خودی کا اپنے صحیح پایہ پر قائم کرنا حسّیات ملّیہ کیا ہے؟ اسلاف اور روشِ اسلاف کی عزت و احترام وہ نقشِ قدم لینا جو اُن کا تھا۔ اُن راہوں پر چلنا جن پر اصولی رنگ میں وہ چلتے تھے۔ اسی مسلک اور طلبِ مسلک کی بابت قرآن مجید میں بالفاظ ذیل اشارہ کیا گیا ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ

اِس آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ طلبِ صراطِ مستقیم ہی فوز و منزل کا اصلی ذریعہ ہے۔ منزل پر پہنچنے کے واسطے بے ہمتی درکار نہیں۔ بزدلی مطلوب نہیں۔ بے حوصلگی کی ضرورت نہیں شکستہ دلی کی مانگ نہیں بلکہ عزمِ صحیح ارادۂ واثق کی ضرورت ہے۔ اور وہ دوسرے الفاظ میں خودی اور خودداری ہے۔

ہم جنہیں روایات کہنہ اور حکایاتِ منزوکہ سمجھتے ہیں اُن ہی سے خودی اور خودداری کے آثار اور نشان ملتے ہیں۔ وہی اُن کی شہادتِ صحیحہ اور سندِ موثوقہ ہے۔ اس ضمن میں حضرتِ اقبال کیا اچھا فرماتے ہیں۔ ؎

اے امانتدارِ تہذیبِ کہن — پشتِ پا بر مسلکِ آبا مزن
من نہ گویم از بتاں بیزار شو — کافرے شو سبحہ و زنّار شو
گر نہ جمعیت حیاتِ ملّت است — کفر ہم سرمایۂ جمعیت است

حضرت اقبال نے فلسفی اور اخلاقی رنگ میں ان بیتوں میں وہ پتہ کی باتیں کہی ہیں۔

جن سے کوئی سلیم فطرت انکار نہیں کرسکتی افراد قوم میں مفلوک اقوام کا یہ فرض ہے کہ اخلاقی پہلو سے خودی اور خودسازی کی ضرورت اور عظمت پران اشعار کے سمجھنے کے بعد غور کریں مسلمان سوچیں کہ اُنکا مسلکِ آبائی کیا ہے؟ مسلک قرآنی۔ مسلک محمدی!!

بہ قول حضرت اقبال ؎

در دلِ مُسلم مقامِ مصطفےٰ است   آبروے ما ز نامِ مصطفےٰ است

مسلک محمدی صرف نماز روزہ اور قبلہ رو ہونے کا نام نہیں بلکہ آں شئے دیگر است وہ اُس قوت اور اُس جذبہ صحیحہ کا نام ہے جو محمدؐ کے قلب سلیم میں رکھا گیا تھا۔ اور جس کی تعلیم قرآن مجید فقرہ فقرہ پروے رہا ہے۔ (نیکی یہ نہیں کہ تم منہ اس طرف اور اس طرف کرو) قرآن کہتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ

خدانے آجتک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی   نہ ہو جسکو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اس آیت کریمہ میں بھی خودی اور خودداری ہی کا ذکر ہے انسان اپنی حالت پر کب متوجہ ہوتا اور کب کمزوریوں کی نظر ثانی کرتا ہے۔ جب وہ اپنی خودداری کے نقش قدم پر چلتا ہے اور خودداری کو حتےالامکان مقدم رکھتا ہے۔ خودی اور خودداری ایک غیرت اور حمیّت ہے۔ خدا بھی غیور ہے۔ خدا اُن ہی لوگوں کی مدد کرتا ہے جو غیور ہوں۔ جو شخصیت جو قوم غیرتمند نہیں ہے۔ قدرت اُس کی امداد نہیں کرتی۔ غیرت اور حمیّت خودی یا نفس قوامہ کا خاصہ ہے۔ انسان کی ذات میں اعلےٰ جذبہ نفس ہی ہے۔ دیکھو کیسا جامع قول ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔

شناخت نفس جب مستلزم شناخت ربّ ہے تو اسی سے نفس انسانی کی عظمت وقار۔ علو۔ جامعیت امتیاز ثابت ہے۔ کہا گیا ہے۔ جس نے نفس پہچان لیا اُس نے ربّ بھی پہچان لیا۔ اللہ اکبر کسقدر عظمت اور کسقدر توقیر ہے۔ باعتبار اعتماد نفس نفس کی خوبیوں نفس کی عظمتوں نفس کے جذبات نفس کے تصرفات سے آگاہ ہونا اور پھر اُنہیں عملی رنگ

میں لاکر دکھانا نفس کی ایک کامل شناخت ہے۔ وہ فضائل اور وہ برکات جو نفس کے حصّہ میں آچکے ہیں۔ وہ بہیئت مجموعی خودی اور خودداری ہیں۔ اُن ہی کا نام انانیت ہے اور اُن ہی کو (میں) بھی کہتے ہیں۔ اِس جذبہ کا مار دینا ایک قسم کی بزدلانہ خودکشی ہے۔ تصرّفِ نفس مستلزم تصرّف خُدا ہے۔ قتلِ نفس قتلِ ذریعہ شناخت خُدا ہے۔ نفس کو زندہ کرو تاکہ اُسکی برکتیں سعادی اور معاشری دونوں رنگ میں زندہ رہیں۔ اصلی زندگی یہی ہے۔ ؎

در عشق نہ تسبیح نہ زنّار ضرور است تارے بکف از طرّۂ دلدار ضرور است

مستند حی القلب صوفیائے کرام کا قول ہے۔ کہ

جو انسان اپنے رتبہ اور مقام سے آگاہ نہیں وہ اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں جب کبھی صوفیائے کرام یہ کہتے ہیں کہ خودی مارو تو اُس کا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ اس جذبہ (میں اور خودداری) کو مار دو کیونکہ یہی تو مایۂ حیات ہے۔

صوفیائے کرام کا منشا اِس سے یہ ہوتا ہے کہ

رعونت اور تکبر مارو اور تزکیہ نفس سے نفس کی اصلی طاقتوں اصلی جذبات کو منصّہ ظہور میں لاکر خود بھی مستفید ہو اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاؤ۔ میں پھر کہتا ہوں ایک صادق صوفی خودی مارتا نہیں بلکہ اُسے تزکیہ سے زندہ کرتا ہے۔ اور اس عمل سے رفتہ رفتہ وہ مقام اور وہ درجہ پالیتا ہے۔ جو نیابت خدائی میں اُس کو بخشا گیا تھا۔ اگر اس کے سوائے خودی کا مفہوم کچھ اور ہے تو وہ ایک خودکشی ہے۔ کیا تزکیہ کے بعد کوئی قوت مرجایا کرتی ہے۔ تزکیہ نام ہے ایک قوت ایک جذبہ کو اپنے اصلی رنگ میں لانیکا نہ کہ اُسے مار دینے اور بیکار کردینے کا۔

حضرت اقبال کس جوش سے کہتے ہیں۔ ؎

از مقامِ خود نداری آگہی بر زبانِ خویش نازی ابلہی

زندگی بر جائے خود بالیدن است از خیابانِ خودی گل چیدن است

تو کہ از نورِ خودی تابندۂ گر خودی محکم کنی پایندۂ

خانہ سوزِ طاعت چل سالہ شو　　　طوفِ خود کن شعلۂ جوّالہ شو

ان اشعار کے پڑھنے سے تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ طائر معانی آشیانہ الفاظ سے بیساختہ نکلنے کی کوشش میں ہیں۔ یہ نہیں کہ بطونِ الفاظ سے وہ کشیدہ ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ظرف یا بطنِ الفاظ ایسا وسیع نہیں۔ کہ اُنکا حامل ہو سکے لفظ ایک ہے اور معانی کثیر مصرع

طوفِ خود کن شعلۂ جوّالہ شو

یہ مصرعہ اپنے اندر اس قدر مضامین معادیہ و معاشریہ رکھتا ہے کہ بلا مبالغہ اس پر ایک مبسوط کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ "طوفِ خود" میں معادی رموز معاشری امور الٰہیات۔ تمدنیات سب صورتیں آگئیں کیسا جامع مصرعہ ہے۔ علم النفس کا نچوڑ اور اصول یا ضابطہ۔ طواف کعبہ بنیادی پتھر ہے۔ طوفِ خود اور طواف کعبہ کی علت غائی ایک ہی ہے۔ طوفِ ضمیر اور طوف کعبہ میں ایک نسبت ہے۔ دونوں میں خودی اور خودداری کا نظارہ ہے۔ دونوں کی غرض خودداری اور خودسازی ہے۔ جہاں سے توحید کی لہریں اُٹھیں وہیں ہر سال طواف کرنے کی ہدایت ہے۔ کعبۂ ضمیر سے ہی توحید اور خداشناسی کی لہریں اُٹھتی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ضمیر ہی کی لہر سے ساحلِ توحید پر جا لگے تھے۔ ضمیر خودداری کا عرش ہے۔ جس قلزم ضمیر سے خودی اور خودداری کی لہریں نہیں اُٹھتیں اُس کا ساحل مقصود کوئی نہیں۔ وہ ہمیشہ گردابِ ذلّت میں غوطہ زن رہتا ہے۔ جس ضمیر میں یہ جوش اور یہ ولولہ ہے۔ وہ اُس کے زور سے اُن مقامات کی سیر کر سکتا ہے۔ جو مقامات خاصہ ہیں اور اُسے کسی اور کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ؎

نداردہیچ کس پروائے محشر　　　دراں کشور کہ غوغائے تو باشد

اسلامی دُنیائے عملی اور علمی کی کساد بازاری اور بے رونقی کا یہی موجب ہے کہ مسلمانوں میں صحیح معنوں میں خودی اور خودداری کا فقدان ہے۔ اس زمانہ میں جب کہ بخطہ ہندوستان بہ برکاتِ دولتِ انگلشیہ دولتِ علوم وفنون کا خزانہ بٹ رہا ہے۔ اور

ہر ملت کے افراد اس مامون زمانہ میں دامن تمنا بھرنے میں مصروف ہیں۔ مسلمان ملی حسیات سے غافل اور باہمی فساد و منافشت مخالفت و معاندت میں منہمک رہ کر اوقات گرامی کا خون کر رہے ہیں اُس کی وجہ یہی ہے کہ اُن میں خودی اور خودداری کا ذوق و شوق نہیں رہا۔ قوتِ خود سازی اور جذبہ خودداری کی لہریں بند ہو چکی ہیں اور طنابِ غیرت شکستہ ہو کر اپنی ہستی کھو چکی ہے۔ حضرت اقبال کیا اچھا فرماتے ہیں ؎

قیمتِ شمشادِ خود نہ شناختی — سرو دیگر را بلند انداختی
مثل نے خود را ز خود کردی تہی — بر نوائے دیگراں دل مے نہی
اے گدائے ریزۂ از خوانِ غیر — جنسِ خود مے جوئی از دوکانِ غیر
شد پریشاں برگ گل چوں بوئے خویش — اے ز خورم کردہ باز آسے خویش

اپنی خوبیوں اور اپنی عمدگیوں کے نشوونما سے غافل رہنا اور اغیار کی غیر مفید خوشہ چینی خودی اور خودداری کے منافی ہے۔ خود کو خالی کر دینے سے مراد یہ ہے۔ کہ اپنی قوتوں اور اپنے جذبات کو بیکار چھوڑ دیا جائے یا ایک پست ہمتی ہی نہیں بلکہ ایک پست فطرتی بھی ہے۔ خودی کا یہ مدعا نہیں خودی سب سے اول خود کو قائم کرتی اور خود سازی سے کام لیتی ہے۔ زمانہ کی شناخت خودی کا ایک بار آور کرشمہ ہے۔ جو خود کو نہیں پہچانتا وہ زمانہ کو بھی نہیں پہچانتا جو زمانہ سے نا آشنا ہے وہ خود سے نا آشنا ہے۔ حضرت اقبال کہتے ہیں۔ ؎

تو کہ از اصلِ زماں آگہ نۂ — از حیاتِ جاوداں آگہ نۂ
ایں و آں پیداست از رفتارِ وقت — زندگی سرّے است از اسرارِ وقت
زندگی از دہر و دہر از زندگی است — لاتسبّوا الدہر فرمانِ نبی است

سبّ دہر سے منع کرنے میں ایک نتیجہ خیز نکتہ ہے۔ دہر بھی ایک خودی اور خودداری رکھتا ہے۔ اور اُسی خودداری کی وجہ سے اُس کا قیام اور اس کی ہستی ہے۔ اور اُس کی خودی اور خودداری تمام کائنات کو محتوی اور تمام موجودات کی محیط ہے۔ خوددار کا یہ کام

نہیں کہ خودداری کی مذمت کرے اور خودی کی تحقیر و ہر کی باگ خدا کے ید قدرت میں ہے قانون سیاسی سے انحراف اور قانون سیاسی کو برا کہنا خود بادشاہ اور گورنمنٹ کی مذمت اور مقابلہ ہے۔ جب دہر کی باگ خدا کے ہاتھ میں ہے جو فعال لما یرید ہے تو پھر دہر کو گالی دینا نعوذ باللہ خدا کا مقابلہ کرنا ہے۔

مسلمانوں میں صلوٰۃ جماعت صلوٰۃ عیدین صلوٰۃ جمعہ اور فریضہ حج کیا ہے عابدانہ رنگ میں خود نمائی۔ خود سازی۔ خود اجتماعی۔ خود ضبطی۔ خود داری عبادتی رنگ میں بھی یہ تعلیم دی گئی ہے۔ کہ وہ پوزیشن وہ درجہ وہ امتیاز وہ مساوات وہ اخوت وہ قدامت وہ قیام موحدانہ اور وہ قعود صادقانہ دکھایا جائے جس کے زور پر بہ یوم میثاق فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا تھا۔ دیکھو جماعت میں نمازی اس طور پر کھڑے ہوتے ہیں۔ جیسے ایک پلٹن کے شجیع و مشہور نوجوان دور سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پلٹن قواعد کر رہی ہے۔ غور کرو گے تو تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ اسلام نے عابدانہ رنگ میں بھی خودداری کا نقشہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ عرصہ عرفات میں جا کر دیکھو اس خودی اور خودداری کا کس خوبصورتی سے دلفریب نظارہ اور مشاہدہ ہوتا ہے۔ ہر ایک حاجی کے چہرہ سے باوجودیکہ وہ اس مقدس زمین میں بالکل اجنبی ہوتا ہے۔ خودی مساوات کے رنگ میں منہ سے بولتی ہے۔ مسجدوں میں نمازی جس شان اور جس دعوے سے اگرچہ وہ مسلمان ہونے سے ایک ہی روز پہلے ذات کا چوہڑہ چمار ہی کیوں نہ ہو ایک امیر اور ایک مقتدر کے دوش بدوش شانہ بہ شانہ بارگاہ الٰہی میں کھڑے ہو کر اللہ اکبر کہتا ہے۔ وہ برکات خودی کا ایک دلفریب نظارہ ہے۔ اس موقعہ پر خودی کا جذبہ درج نفس سے خدا خدا کہتا ہوا گونجتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔ وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ

وہ کونسا خزانہ یا مواد ہے جو ہمارے نفوس میں قدرت نے ودیعت کیا ہے۔ گڑ شکر یا کوئی اور جنس کوئی اور جنس نہیں نفس میں وہ قوتیں اور وہ جذبات ودیعت کئے

گئے ہیں۔ جو خودی اور خودداری کا پیش خیمہ ہیں۔ یا جن سے خودی کا نشو و نما ہوتا ہے۔ انسانی قلب اسرار خودی کا ایک بے بہا خزانہ اور لاانتہا دہانہ ہے۔ مغربی قومیں رفتہ رفتہ اُس دہانہ وسیعہ اور خزانۂ عامرہ سے واقف ہو کر اس پر متصرف اور قابض ہو چکی ہیں اور مشرقی قومیں رفتہ رفتہ اُسے کھوتی جاتی یا کھو چکی ہیں۔ خودشناسی۔ خودسازی۔ خودنمائی اور خودداری کا مذاق ہی نہیں رہا۔ خودتلفی کا نام خودسازی ہے اور خودداری کی تعبیر خودفراموشی کی جاتی ہے۔ حوصلے پست پڑ گئے۔ اُمنگیں مٹ گئیں۔ بلند خیالیوں پر پانی پھر گیا جذبہ تنازع للبقاء کی مٹی خراب ہو گئی۔ حس ماری گئی۔ آنکھ کی زندگی بصارت۔ گوش کی شنوائی۔ اعصاب کی زندگی تحرک زبان کی زندگی طلاقت اور نفس کی زندگی خودی اور خودداری ہے۔ کیا آنکھ بغیر بصارت کے اور گوش بغیر سماعت کے کام دے سکتے ہیں؟ جس آنکھ میں نم نہیں جو بصارت کے نور سے خالی ہے۔ وہ آنکھ نہیں بلکہ پتھر جو جان خودی نہیں رکھتی۔ جو انسان مراحل خودداری سے ناآشنا ہے۔ وہ جان نہیں۔ ایک بلبلہ۔ وہ انسان نہیں بلکہ ایک بے حس حیوان

گریۂ واقف شمع ساں مارا بود آب بقا　　زندگی داریم تا در دیدہ نم داریم ما

ذرا خودی کی آنکھ سے عالم و عالمیاں کا تماشا کرو۔ واقعات عالم اور تصرفات دہر پر نظر ڈالو تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ خودی کی عینک اور خودداری کی دوربین کیا کچھ دکھا سکتی اور کیا کچھ طاقت رکھتی ہے۔ ؎

آں چشم را بہ بیں بہ چہ ناز آفریدہ اند　　خونریز و مست و عربدہ ساز آفریدہ اند

حضرت منصور علیہ الرحمۃ نے جب خودی کی عینک سے اپنے آپ کا تماشا کیا تو انہیں معلوم ہو گیا۔ کہ وہ کیا کچھ درجہ رکھتا ہے۔ اور اُن کے جذبات اور قوتوں میں کیا کچھ مصالحہ بھرا گیا ہے۔ منصور کے انا الحق کہنے سے یہ تو منشا نہیں تھا کہ وہ خود خدا ہے بلکہ مایۂ انانیت کے جوش میں آکر بے ساختہ مُنہ سے یہ صدا نکل گئی "عین الحق"۔ عین الحق شیشۂ انانیت سے جب خدا کو دیکھا تو اپنی انانیت کا تعلق بھی اُسی سے پایا اور اپنی انانیت بھی اُسی نقش کا

عکس نکلا۔ اور منصور کو اپنی قیمت اور اپنا پایۂ خودی کے رنگ میں معلوم ہو گیا۔ بے ساختہ بول اُٹھا۔ عین الحق۔ عین الحق۔ ؎

خوش آں روزے کہ آں روئے جہاں افروز بنماید　　خدا آں روز بنماید خدا آں روز بنماید

تکبر و غرور کا ترک تزکیہ نفس خودی کا تزکیہ اور خودداری کا تنبیہ ہے۔ خودی مرتی نہیں بلکہ تزکیہ پاکر اپنے اصلی مرکز پر قائم ہوتی ہے۔ اور پھر اُن مقاصد اور مطالب کی تخلیق اور تولید ہونے لگتی ہے۔ جو مقاصد لازمہ انسانیت اور موجب اعتماد نفس ہوتے ہیں۔ زندگی کے مقاصد جایزہ اور مطالب حمیدہ سے منہ پھیر نا خود کو مُردہ بنانا ہے۔

"قرآن کہتا ہے خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو"

یہ تزکیہ نفس نہیں بلکہ تکثیف نفس کیونکہ اس عمل سے نفس کی قوتیں اور جذبات ارتقائی منازل سے گرتے گرتے قعرِ ذلت میں جا پڑتے ہیں ؎

دل ز سوز آرزو گیرد حیات　　غیر حق میرد چو او گیرد حیات

کُل دنیا اور اشیاء کائنات کی ترقی اصول ارتقاء کے ماتحت دن بدن تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ ارتقاء کیا ہے ایک خودی جب تک عمل ارتقاء رہتا ہے ترقی بھی رہتی ہے جب عمل ارتقاء باقی نہیں رہتا ترقی بھی بند ہو جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں جب تک خودی رہتی ہے تب تک ہماری ہستیاں بلند پرواز رہتی ہیں۔ اور جب خودی مٹ جاتی ہے یا مٹا دی جاتی ہے تو پستی غالب آجاتی ہے۔ کسی بچہ سے پوچھ کر دیکھو بشرطیکہ وہ فریب تخیل میں نہ آچکا ہو۔ یہی کہے گا کہ وہ بلند پروازی کا مفتون ہے۔ جنہیں تم عابد۔ زاہد مرتاض معتکف کہتے ہو اُن کی عبادات۔ ریاضتیں۔ اعتکافات بھی خود سازی خود نمائی سے خالی نہیں ہوتیں۔ خودی اور خودداری ایک قسم کی ممتاز خواہش ہے۔ عبادت اور زہد و ریاضت کی غرض بھی ایک ممتاز خواہش ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کو بھی انانیت پر ہی فخر ہوتا ہے۔ انانیت ہی کی طلب اور تزکیہ میں وہ راتیں ریاضت میں اور دن عبادت میں گزارتے ہیں۔ وہ لوگ عملی پہلو سے اپنی انانیت کی تنقید کرتے ہیں تاکہ ذات

کثافت اور مواد رذالت کا تزکیہ اور تصفیہ ہو جائے۔ ؎

شاید کہ یار گوش بہ فریاد من دہد　　تغییرے دہم دگر آواز خویش را

جب انسان کی طبیعت پر پست خیالی کا غبار آجاتا ہے اور اُس کے ارادوں میں استقلال اور صداقت نہیں رہتی تو خودی بھی رفتہ رفتہ مدھم پڑتی جاتی ہے۔ حسّیں بالکل ماری جاتی ہیں۔ ادراک بوسیدہ پڑتا جاتا ہے۔ حضرت اقبال نے ان موانعات اور تاثرات کا ذکر بہ سلسلہ حکایت گوسفنداں بہ اخلاقی پہلو جس خوبصورتی سے کیا ہے وہ پڑھنے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے اکثر شخصیتیں اور اکثر قومیں محض دوسروں کی اندھی ریس سے تباہ ہوتی ہیں۔ مسلک آبائی کے ترک سے اُن کی غیرت اُن کی حمیّت اور اُن کی ہمت رفتہ رفتہ معرض زوال میں آتی گئی یہاں تک کہ اُن کی حسّیات ملّیہ بھی قریباً معدوم ہو گئیں حضرت اقبال فرماتے ہیں ؎

آں جنونِ کوششِ کامل نہ ماند　　آں تقاضائے عمل در دل نماند

شیر بیدار از فسوں میش خفت　　انحطاط خویش را تہذیب گفت

جلد باز لوگوں کے خیال میں بعض وقت بعض نقلیں بظاہر موجب ترقی اور عروج ثابت ہوتی ہیں لیکن دراصل اُن کا نتیجہ مایوسی اور پستی ہوتا ہے نقلی تہذیب اکثر اوقات اُن جذبات کا کفارہ ہوتی ہے جو ایک شخصیت یا ایک قوم کی روح و رواں ہوتے ہیں۔ اور جن کے بغیر وہ شخصیت یا وہ قوم زندہ نہیں رہ سکتی ہر قوم اور ہر شخص کی ترقی اور عروج کے بعض وسائل منفردانہ اور جداگانہ ہوتے ہیں۔ جو قومیں سرد ممالک میں رہتی ہیں اُن کے سامان زندگی اُن قوموں سے نسبتاً نوعیت میں فرق رکھتے ہیں جو گرم حصوں میں سکونت رکھتی ہیں۔

مراحل خودی

جس طرح نفس کے اقسام یا انواع قرآن مجید میں تین بیان ہوئے ہیں اسی طرح حضرت اقبال نے خودی کے مراحل بھی تین رکھے ہیں۔

(الف) مرحلۂ اطاعت (ب) مرحلۂ ضبط نفس (ج) مرحلۂ نیابت الٰہی

بہ تسلسل مراحل اطاعت فرماتے ہیں۔ ؎

دراطاعت کوش اے غفلت شعار   مے شود از جبر پیدا اختیار

سچ ہے فلسفہ محض پڑھنے اور پاس کرنے سے نہیں آتا فلسفہ کا درس خود طبیعت دیتی ہے۔ اِس شعر میں حضرت اقبال کے دل و دماغ اور قلم سے وہ جامع معنے خیز الفاظ نکل گئے۔ ہیں کہ جن پر خود اُنہیں بھی فخر کرنا زیبا ہے۔

جو لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ خودی جب تک ماری نہ جائے تب تک اطاعت ہو نہیں سکتی اور خودی کا نتیجہ ایک قسم کی بے اختیاری ہے وہ اِس شعر سے سمجھ سکتے ہیں۔ کہ اُنکے مافی الضمیر کے خلاف اطاعت سے ایک قسم کی خودی پیدا ہوتی ہے۔ اور انسان ایک قسم کا اختیار حاصل کرتا ہے بعض لوگوں کے خیال میں اطاعت بظاہر ایک قسم کی مجبوری ہے یا محض بیکسی کا اظہار بعض لوگوں کا مقولہ ہے کہ اطاعت الٰہی یا اطاعتِ گورنمنٹ سے آزادی اور آزاد منشی کا خون ہوتا ہے۔ اختیارات باقی نہیں رہتے حضرت اقبال فرماتے ہیں اطاعت سے قوتیں۔ جذبات اختیارات سلب نہیں ہوتے بلکہ جب غاشیہ اطاعت دوشِ ادب پر اُٹھایا جاتا ہے تو اُس کے صلہ میں مطاع کی جانب سے اختیار کی ڈگری یا خلعتِ اختیار ملتا ہے۔

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

اطاعت اسواسطے نہیں کی جاتی کہ اگلی حالت اگلی پوزیشن بھی سلب ہو جاوے۔ بلکہ اسواسطے کہ کچھ مزید ملے۔ اور درجوں میں ترقی ہو اطاعت تزکیہ ہے۔ اور تزکیہ موجب تکشیف نہیں ہو سکتا۔ دیکھو تعلیم و تدریس کا نتیجہ کیسا نکلتا ہے۔ جس میں کچھ نہ کچھ جبر ہوتا ہے۔ لوہار آگ میں لوہا تپا کر آلات بناتا ہے۔ اور وہی آلات بعد میں ایک امتیاز حاصل کرتے ہیں۔ قلم سر تیز شو اگر صفحہ قرطاس پر ہی نہیں بلکہ صفحہ کائنات پر حکمرانی کرتا ہے ؎

قلم گوید کہ من شاہ جہانم   قلم کش را بدولت مے رسانم

(ب) بر ضمن مرحلہ ضبط نفس کہتے ہیں ؎

مرد شو آور زمامِ او بکف ❊ تا شوی گوہر اگر باشی خزف
ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں ❊ مے شود فرماں پذیر از دیگراں
خوف را در سینۂ او راہ نیست ❊ خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست

اللہ اللہ کس شان کا وعظ ہے۔ ضبط نفس کا فلسفہ کس خوبصورتی اور کس دلاویزی سے بیان کیا گیا ہے۔ گویا اپنی زبان سے نفس خود ہی اپنی کہانی کہہ رہا ہے۔ خودی اپنا علاج خود ہی بیان کر رہی ہے۔ ضبط نفس کیا ہے؟ خودی یا نفس کا تزکیہ اور خودداری کا تصفیہ۔ خودی۔ اور نفس قوامہ کو اُس ضابطہ پر لانا اور اُس مرحلہ پر پہنچانا جس سے اُس کی طاقتیں اُس کے تصرفات بہ رنگ حسنہ وجود پذیر ہوں۔ ضبط نفس سے نفس کشی مراد نہیں۔ بلکہ ضابطہ نفس سے آگاہ ہو کر اُس پر قادر ہونا اور اُس سے اُس کی حیثیت کے مطابق کام لینا لوگ اکثر اس تمنّا میں رہتے ہیں کہ دوسروں پر حکمران ہوں۔ بیشک یہ بھی ایک حد تک خواہش خودی کی ہے لیکن اپنے نفس کی حکومت اس سے بھی کہیں زیادہ خوش آیند اور نتیجہ خیز ہے۔ جو شخص اپنا نفس قابو میں رکھتا اور اُسے ضابطہ سے چلاتا ہے وہ قانون اور کائنات پر حکومت کرتا ہے۔ جو شخص خودی اور خودداری کے ماتحت اپنی عزّت اپنے احترام کا خود حافظ ہوتا ہے۔ وہ قانون پر گویا حکومت کرتا ہے۔ قانون اُس کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جو شخص ضبط نفس سے عاری ہے۔ وہ مختلف قیود کا پابند رہ کر دوسروں کے ہاتھوں ذلیل اور خوار ہوتا ہے۔

دیکھو صوفیائے کرام اور صحیح الخیال مشاہیر دین ضبط نفس سے کس طرح ابنائے جنس کے مخدوم بن جاتے ہیں۔ اور کس طرح اعتماد نفس لوگوں میں اُنہیں معتمد بناتا ہے۔ جن لوگوں نے ضبط نفس کی خودکشی کے مترادف تعبیر کی ہے وہ غلطی پر ہیں۔ لا رھبانیۃ فی الاسلام

(ج) یہ تذکرہ مرحلہ نیابت الٰہی ارشاد ہوتا ہے۔

گر شتر بانی جہاں بانی کنی ❊ زیب سر تاج سلیمانی کنی
نائب حق در جہاں بودن خوش است ❊ بر عناصر حکمراں بودن خوش است

ان اشعار میں شاعر ثابت کرتا ہے کہ

یہ یوم میثاق درگاہِ ایزدی سے جو انعام و اکرام علو فطرت کے پیرایہ میں عطا ہو کر گردیں اور فرشتوں سے سجدہ و سلام حضرتِ انسان کو کرایا گیا تھا۔ اور جو تاجِ خلافت اُس کے سرِ عبودیت پر بایں کرّو فر رکھا گیا۔ اُس کا تحفظ اور اُس کی وضع داری ہر حالت میں انسان پر لازم اور فرض ہے۔ نیابتِ خُدا ایک ایسا عظیم الشان احترام ہے جو ساری کائنات میں کسی اور کو عطا نہیں ہُوا۔ یہ قرعہ انسان ہی کے نام پر پڑا۔ اور اُسی نے یہ بوجھ اُٹھایا۔

آسمان بارِ امانت نتوانست کشید ۔۔۔۔ قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند

اِس بارِ نیابت کا انتظام بہ خوش اسلوبی اُسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ کہ جب انسان کسی ایسی نفسانی طاقت اور جذبہ سے کام لے جو سب طاقتوں اور جذبات سے اعلےٰ اور مایۂ ناز ہو وہ صرف خودی یا خودداری ہے۔ صرف یہی ایک کفیل ہو سکتی ہے باقی سب طاقتیں اور سب جذبات اس کے خوشہ چین ہیں۔ جب یہ طاقت اُٹھ جاتی ہے تو سب فضیلتیں اور سب قسم کی کامیابیاں بھی باقی نہیں رہتیں۔

تا سرِ من از میانہ برخواست ۔۔۔۔ صد فتنہ زہر کرانہ برخواست

خودی کی بحث میں قناعت کا سوال بھی آجاتا ہے۔ قناعت اُس حد تک۔ جو بعض لوگوں کے زعم میں ہے صحیح پہلو نہیں رکھتی جس طرح خودی کے معنوں میں بعض کو مغالطہ لگ گیا ہے۔ اُسی طرح قناعت کا مفہوم بھی اکثر غلط سمجھا گیا ہے اگر قناعت کا وہی مفہوم ہے جو ہم میں سے بعض کا معمول ہے تو وہ قرآن کے خلاف ہے۔

قرآن کہتا ہے:۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ

"مجھ سے مانگو میں دونگا۔

"دین اور دُنیا میں حسنات کی خواہش رکھو اور دُعا کرتے رہو۔

اہدنا الصراط المستقیم بار بار پڑھو تاکہ بزدلانہ قناعت سے خلاصی ہو قناعت کے معنے بھی ضبط نفس ہی کے ہیں۔ نہ کہ بزدلانہ خودکشی شخصی اور اجتماعی خودی اور خودداری کا زندہ رکھنا ضبط نفس کے ماتحت شخصیتوں اور قوموں کا زندہ رہنا ہے۔ انسان کا یہ فرض ہے کہ اُس علو اُس شان اور اُس امتیاز کا ہمیشہ جویاں اور خواہاں رہے۔ جو اس کو باصول تنازع للبقاء اس احاطہ کائنات میں مل سکتا ہے۔ جس طرح ایک جمہوری حکومت میں ہر شخص پریزیڈنٹ بننے کے موقع کی تلاش اور امید میں رہ سکتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان کا یہ شرائط ضبطِ نفس بذریعہ خودی معاوی اور معاشری رنگ میں جویاں اور طالب علو شان رہنا زہد و ریاضت کے خلاف نہیں اور نہ دینداری اُس کی مانع ہے اسلام میں مساوات کا سبق اسی نقطہ نگاہ سے دیا گیا ہے۔ کہ ہر شخص اور ہر فرد ملت بلند خیالی اور بلند پروازی سے کام لے۔ اگر کوئی ولی بن سکتا ہے تو بنے۔ اور اگر کوئی قطب و ابدال ہونے کی آرزو رکھتا ہے تو کوشش کرے ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ ایں درگہ ما درگہ نا امیدی نیست

حضرت شیخ اکبر محی الدین ایک موقعہ پر فرماتے ہیں:۔

"میں ہی قرآن مجید اور سبع مثانی ہوں"

"میں روح کی روح ہوں نہ برتنوں کی روح"

ان کلمات سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ انسان کا درجہ اور اُسکی امتیازی پوزیشن اسقدر ارفع اور اعلےٰ ہے کہ اُس کا وقار اور اُس کا احترام ان مدارج تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ اور اُسکی استعداد کا پیمانہ اسقدر بلند و بالا ہے۔ کیوں بلند و بالا ہے؟ اس واسطے کہ وہ اُس ذات کا عکس خلقی اور شائبہ کن ہے۔ جو ذات علت العلل اور کامل ہے۔ روح کی روح یعنی ذات صمدی کے خاص ارادوں میں سے خلقتِ انسان ایک عظیم الشان ارادہ ہے۔ خدا خود ہے اور خودی ہوگا۔ اسی خودی کی ہم بھی تماشا ہیں۔ خودی چھوڑ دینا اُس نسبت عظیمہ کا چھوڑ دینا ہے جو ہمیں خدا سے ہے

ہم کیا ہیں؟ خدا کی خودی کا ممتاز اور زندہ نمونہ ؎

محبت را تلف کردی باغیار | چہ خواہی داد تاوان محبت

لوگ کہتے ہیں محبت اور الفت و عشق میں خودی مرتی اور خودداری کھوئی جاتی ہے۔ یہ غلط ہے محبت اور عشق نام ہی خودی اور خودداری کا ہے جذبہ خودی اشتعال میں آکر اُس مقام عظیمہ کی تلاش میں لگ جاتا ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ عاشق اپنی خودی کا تماشا دکھاتا ہے اور مطلوب اپنی خودی سے کام لیتا ہے دونوں خودیاں معرکہ آرا ہوتی ہیں ؎

بزور ہمت مردانہ گردید | زلیخا مرد میدان محبت

مسلماناں چو ایماں یاد گیرید | زمن احکام و ارکان محبت

عذرِ طوالت

مثنوی اسرار خودی کا ہر شعر اور ہر مصرعہ حامل اسرار ہونے کی وجہ سے دعوت انکشاف اسرار اور درخواستِ اظہارِ مقاصدِ علیا کر رہا ہے۔ قلم بھی ان کا ہم نوا ہو کر لکھنے سے رُکتا نہیں دماغ اُن خیالات کے ہجوم سے جو خودی کا سرچشمہ ہیں لبالب ہو رہا ہے۔ بحرِ ضمیر میں خودداری کی موجیں اُٹھ رہی ہیں۔ ادھر طوالت اور بعض ناظرین کی اختصار پسندی اور آزردے نیرنگی قلم روکتی اور ہاتھ پکڑ پکڑ کر جھنجھوڑتی ہے۔ مجبوراً اختتامی مراحل پیش نظر رکھ کر یہ کہونگا کہ لوگ ایک دفعہ مثنوی اسرار خودی پڑھیں اور ضرور پڑھیں ممکن ہے کہ اس وقت بعض لوگوں کی سمجھ میں مثنوی نہ آئے یا وہ اُسے ایک معمولی مثنوی خیال کریں لیکن ایک وقت ایسا آئیگا کہ یہ مثنوی لوگوں میں ایک خاص عزت پیدا کر کے رہیگی۔ ذرا انصاف سے دیکھو کہ حضرت اقبال نے کس خوبی کس روشن دماغی سے اسرار خودی کے چہرہ سے نقاب اُٹھائی ہے اور کس عمدگی و متانت سے خودی کی خوبیوں اور حسنات کا نقشہ دکھایا ہے۔ ممکن ہے بعض اصحاب کے نزدیک یہ اجتہاد اقبالی خلافِ بعض روایات عامہ ہو۔ میری رائے میں یہ اقبالی اجتہاد نہ تو خلاف ملت ہے اور نہ متضاد روایات ملت ہاں اسکا پیرایہ

اور زمین کسی قدر واقع ہوئی ہے۔ اور طرز بیان ایک خاص جدت لئے ہوئے ہے جو کنار تاثر اور آغوش کشش و جذب کا پرورش یافتہ ہے۔ ورنہ تبلیغ دہی ہے۔ جو قرآن اور اسلام یا فلسفہ اسلام کر چکا ہے۔ قرآن پڑھنے سے اس مثنوی کے مضامین دلاویز کی قدر و قیمت اور بھی واضح ہونے لگتی ہے۔ اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ قرآن مجید کا عملی فلسفہ نظم کیا گیا ہے۔

مقام نشو و نمائے خودی

خودی کی ہستی یا خودی کا جذبہ کب صحیح رنگ میں نشو و نما پاتا ہے۔ اور کب زوال پذیر ہوتا ہے؟ جب خودی کے خیالات خودی کے تصرفات خودی کی کیفیات یا نفس امارہ نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ ایک ضغطہ میں نہ ہوں۔ جب کسی ضغطہ میں ہوں تو اُن کی ہستی معرضِ خوف میں ہوتی ہے۔ مغربی اقوام خصوصاً قوم انگریزی میں ایسا خودی کش ضغطہ نہیں ہے۔ خودی خوداری اور خود سازی کے نشو و نما کے واسطے اقوام مغربی میں اسی طرح کی جائز اور مامون آزادی اور آزاد منشی موجود اور معمول ہے جس طرح کسی وقت اسلام میں مرعی اور معمول تھی۔ مغربی قومیں اپنی قوت عاملہ اور ذوق عمل کی وجہ سے زندگی کے بالمقابل اسرار سمجھنے کے لئے بہ قول حضرت اقبال گزوں نہیں بلکہ میلوں آگے ہیں اور شرقی اقوام کے واسطے اُن کا زندہ عمل ایک زندہ رہنما کا درجہ رکھتا ہے۔ بالخصوص انگریزی قوم کی عملی آنکھ اسی احساس واقعات عالم قوت خود سازی سادہ خود ضبطی بے لوث و غیورانہ ہمت و سعی قومی تدین اور تحفظ تمام مشرقی اقوام کے واسطے عموماً اور رعایائے ہند کے لئے خصوصاً ایک خوش آیند نمونہ ہے۔

انگریزی قوم کی برکاتِ عملیہ میں سے سب سے زیادہ اور ممتاز برکت وہ ضابطہ صیانت اور قانون حفاظت ہے۔ جو ہر نفس ناطقہ کی خودی اور خودداری کا ضامن اور کفیل ہے یہ اس واسطے کہ انگریزی قوم میں حسِ واقعات اور اخذ واقعات اور انتخاب واقعات کا مادہ اور

اقوام یورپ کی نسبت زیادہ مستحسن آزاد استوار اور حکیمانہ واقعہ ہوا ہے۔

میری التجا

میں اخیر پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اخلاقی اور تمدنی رنگ میں مثنوی اسرار خودی مایۂ حیات اور دُرج اسرار ہے۔ ہر ایک شخص کے ہاتھ میں اُس کی ایک ایک کاپی ہونی چاہیے۔ یہ مثنوی اخلاقی جرأت کا سراپا اور ضبط نفس و تزکیہ نفس و تحفظ نفس کا ایک موثر ضابطہ ہے۔ یہ وہ نغمہ ولاویز ہے۔ جسکا سودا ہر سر میں ہے جس کی تان سے ہر شخص فطرتاً واقف اور آشنا ہے جو اپنے اندر ایک اثر اور ایک جذب رکھتا ہے۔ حضرت اقبال محض بوجہ شاعر ہونے یا ایک وجیہ الرتبہ ہونے ہی کے افراد قوم میں ممتاز نہیں ہیں۔ بلکہ اُس صادق اخلاص اور بے ریا محبت کی وجہ سے بھی جو اُنہیں اسلام اور حضرت رسول کریم سے ہے۔ اور باعتبار اُس دردِ قومی کے جو اُنکے رگ و ریشہ میں ساری ہے۔ دیکھو کس درد بھرے دل سے فرماتے ہیں ؎

در دلِ مسلم مقام مصطفےٰ است　　آبروے ما زنام مصطفےٰ است
ما کہ دربانِ حصارِ ملتیم　　کافر از ترک شعارِ ملتیم
ساقیٔ دیرینہ را ساغر شکست　　بزم رندانِ حجازی برشکست
کعبہ آباد است از اصنام ما　　خندہ زن کفر است بر اسلام ما
دل ز نقش لا الٰہ بیگانۂ　　از صنم ہائے ہوس بت خانۂ

ہم ڈاکٹر اقبال کے بدل مشکور ہیں کہ اُن کی بدولت ہمیں دولت فلسفہ خودی یا دولت قانون جد و جہد سے جو کائناتی افراد کی زندگی کا ایک ممتاز اور لازمی جزو ہے۔ متمتع ہونے کا موقعہ ملا اور وہ عہد فطرت یاد آگیا جو ہم سے لیا گیا تھا۔ اجتہاد اقبال یا مثنوی اقبال فطرت سے جنگ نہیں کرتی بلکہ فطرت کے عہد و پیمان کمال صداقت اور متانت سے یاد دلاتی ہے۔ صدہا مثنویاں لکھی گئی ہونگی۔ لیکن اسرار خودی کے فلسفہ پر غالباً یہی ایک مستقل مثنوی یا مستقل بحث ہے۔ اس مثنوی کی شان اور طرز ہی کچھ

اور ہے یہ صحیحہ فطرت اور قانون جدوجہد کی ایک صحیح تفسیر اور مقبول تنقید ہے جس سے انسانی فطرت مضطرب نہیں ہوتی۔ بلکہ مستعد ارباب ذوق دیکھ سکتے ہیں کہ ہر شعر کسقدر مضامین اعلےٰ اور خیالات ارفع کا جامع اور حامل ہے۔ اس سے اول ملک و قوم نے جس محبت اور جوش و فراخ دلی سے حضرت اقبال کی ادبی خدمات کا خیر مقدم کیا ہے یہ مثنوی اُس سے بھی اخلاقی رنگ میں زیادہ خراج تحسین وصول کر کے رہیگی۔ حضرت اقبال نے سرزمین ادبیہ میں قانون جدوجہد اور اخلاقی جُرأت کی بنام خودی ایک نئی داغ بیل ڈالی ہے ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

حضرت اقبال کی جانب سے معجزہ ادبیہ یعنی مثنوی اسرار خودی کیا تبلیغ کرتی ہے؟ اپنی مدد آپ کی اپنے پر بھروسہ کرنے کی۔ مثنوی کیا تعلیم دیتی ہے؟ ہمیشہ اپنی عقل سے کام خود ہی اپنے مشیر رہو۔ کیونکہ اگر تم خود ایسا نہیں کرتے ہو تو یہ امید کرنا فضول ہے کہ کوئی دوسرا تمہارے واسطے کچھ کریگا۔ جو باتیں تمہیں کرنی ہیں مضبوطی سے اُن کا قصد کرو۔ اور بغیر پہلوتہی کے اپنا قصد پورا کرو۔

حضرت سلیمان کا قول ہے۔ جس آدمی کو تو اپنے فرائض انجام دینے میں سرگرم دیکھتا ہے۔ وہ بادشاہوں کے سامنے کھڑا ہوگا۔ ایک یورپین گیٹہ نامی کا انگریزوں کی نسبت یہ قول ہے کہ انگریزوں کی آمد اور طرز معاشرت میں کچھ ایسا استقلال ہے۔ جو نہایت ہی خاموشی لئے ہوتا ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ گویا ہر جگہ کے یہی مالک ہیں۔ اور ساری دُنیا اُن ہی کی ہے۔ دوسری قوموں پر اُن کو یہ فوقیت ہے کہ اُن میں ویسے ہی ہونے کی ہمت ہے۔ جیسا کہ فطرت نے اُنہیں بنایا ہے۔ وہ ادھورے نہیں ہیں بلکہ پُورے آدمی ہیں۔ یہ سب مناظر سب مراحل کس جذبہ کا کرشمہ اور کس قوت کے ذریات ہیں۔ خودی اور خودداری کی یورپین قوموں بالخصوص انگریزی قوم میں

خودی اور خودداری ہی کام کر رہی ہے۔ اور وہی اُن کی ترقیات اور عروج کا موجب ہے۔ اور انہیں اُس پر بجا طور پر فخر اور ناز ہے۔

بعض لوگ مثنوی اسرار خودی کا نام سُنکر کسی قدر متعجب ہوتے ہیں۔ اُس پرانی غلطی کی وجہ سے جو انہیں خودی کے معنوں کے متعلق ہے۔ حضرت اقبال نے اس مثنوی کے شروع میں ہی یہ مغالطہ رفع کر دیا۔ میں باادب ایسے لوگوں سے پوچھ سکتا ہوں۔ کہ یہ اخلاقی کتابیں جو پڑھائی جاتی ہیں۔ اور یہ اخلاقی سبق جو دیئے جاتے ہیں۔ انکا اصل مطلب کیا ہے؟ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ان کا اعلےٰ مطلب خودی اور خودداری کا قائم کرنا ہی ہے۔ جب ایک شخص کو کتب اخلاقی اور قانون شرعی میں صداقت کی تعلیم دی جاتی ہے تو اُس کا دوسرے الفاظ میں اور مطلب کیا ہوتا ہے۔ یہی کہ جو ہو سو ہو صداقت سے روگردانی نہ ہو۔ یہ اخلاقی جُرأت اور ہے کیا؟ یہی خودی اور خودداری ہی تو ہے۔ قرآن ذرا غور سے پڑھو احادیث کا مطالعہ ذرا وسعتِ قلب سے کرو۔ یہ تمام مجموعہ خودداری ہی تو سکھا رہا ہے۔ مجھے کسی ملامت کا خوف نہیں۔ میں صاف صاف کہوں گا۔ کہ:۔

دُنیا بھر میں قرآن سے زیادہ تر اور کوئی کتاب صحیح معنوں میں خودی اور خودداری کا سبق نہیں دیتی۔ اُس کا اہم اور بڑا وعظ یہی ہے۔ قرآن کو اِس بات پر بجا فخر ہے کہ وہ انسان کو انسان کی حیثیت سے رکھنا چاہتا اور پورا خوددار بننے کی تاکید کرتا ہے۔

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

مومن کون ہے جو خودی اور خودداری رکھتا ہو۔ قرآن بار بار پڑھو تاکہ تم پر مثنوی اقبال کے راز کھلیں۔ اور تمہیں معلوم ہو سکے کہ یہ مثنوی قرآن کی ایک جیّد اور دلاویز تفسیر ہے۔

اپنے اپنے رنگ میں قرآن مجید کی صدہا تفسیریں لکھی گئی ہیں۔ حضرت اقبال نے یہ اپنے رنگ میں لکھی اور یہ اکثر رنگوں پر غالب ہے۔ گو حضرت اقبال نے مثنوی میں یہ

دعوے نہیں کیا۔ مگر میں بحیثیت ایک نقاد ہونیکے یہ کہونگا کہ یہ ایک تفسیر یا تعبیر ہے گو کہ صرف چند اور مخصوص مسائل ہی کی ہو۔ یہ اخلاقی تفسیر اور سیرتانہ مثنوی قوم کے تمدنی اور اخلاقی خزانہ میں حضرت اقبال کی جانب سے پہلی قسط انفرادی رنگ میں ادا ہوئی ہے ہمیں امید ہے کہ اسی طرح اسی سلسلہ اور محال اخلاقی میں دوسری قسط اجتماعی رنگ میں بھی اسی درد اور اسی شان و شوکت سے داخل ہو کر رہیگی۔ اور یہ دونوں ادبی۔ تمدنی اور اخلاقی اقساط قوم و ملک کی تمدنی۔ اخلاقی اور ادبی دولت مندی۔ تموّل۔ اقتصادیات۔ فارغ البالی اور سرسبزی کے مراحل میں ایک کامل ذریعہ اور مفید ضابطہ ثابت ہونگی۔ اور لوگ شکریہ کے ساتھ حضرت اقبال کی نازک خیالیوں سے مستفید ہو کر اخلاقی اور عملی رنگ میں ادائے خراجِ تحسین سے معذور نہیں رہینگے۔ اخیر میں ہم عنترہ بن شداد حجازی کے دو شعر درج کر کے یہ ریویو ختم کرتے ہیں۔ یہ دو شعر گویا اس مثنوی کا عنترہ کی زبانی خلاصہ ہیں ؎

لَا تَسْقِنِیْ مَاءَ الْحَیَاۃِ بِذِلَّۃٍ
بَلْ فَاسْقِنِیْ بِالْعِزِّ طُعْمَ الْحَنْظَلِ

مَاءُ الْحَیَاتِ بِذِلَّۃٍ کَجَھَنَّمٍ
وَجَھَنَّمُ بِالْعِزِّ اَفْضَلُ مَنْزِلٍ

؎ آبِ حیات کا ذلت کے ساتھ پینا تسکین بخش نہیں بلکہ کڑوی سے عزت کے ساتھ پی سکتے ہیں۔

؎ آبِ حیات ذلت کے ساتھ گویا جہنم اور جہنم عزت کے ساتھ اعلےٰ منزل ہے۔

اقبال کی نظمیں مختلف طور و شاعری کی (ایک ہی تقطیع پر نہایت خوبصورت ٹائپ ڈیزائن) چھپی ہوئی

مرغوب ایجنسی لاہور سے بارعایت مل سکتی ہیں

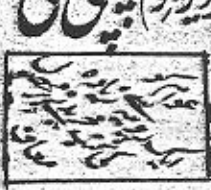

فراق یوسف ۔ شکوہ ۔ جواب شکوہ ۔ نالۂ یتیم ۔ شمع اور شاعر ۔ پیغام عمل

۴ر ۲ر ۲ہر ۲ہر ۴ہر ۱ر

مکمل ترانہ ۔ ترانہ ۔ سوز بیوہ ۔ دنیا کی اجڑی محفل ۔ یتیموں کی فریاد

۲ر ؍ر ۲ر ۴ہر ۴ر

قبلہ نما ۔ شکریہ یورپ ۔ موج زمزم ۔ تحفۃ الاخوان ۔ چپ کی داد ۔ اچھے کپڑے

۱ر ۲؍ر ۳ر ۱ہر ۱ر ۳ر

...گی اور ناظر ۔ ہمارا خدا ۔ ہمارا قرآن ۔ میرا خواب ۔ اخوت ۔ خیرات

۲ر ۱ر ۲ر ۳ر ۱ر ۱ر

تصویر یتیمی ۔ نغمۂ توحید ۔ کلام نیرنگ ۔ انتخاب جدید ۔ مدینے کی کھجور

۴ہر ۳ر ۸ہر ۹ر ۳ر

شعلۂ طور ۔ دربار رسول ۔ ہمارا رسول ۔ ایثار مسلم ۔ تاروں کا گیت

۲ر ۳ر ۲ر ۲ر ۲ر

رباعیات قلندر ۔ عرض حال ۔ بیاض عید ۔ شمع محفل ۔ خیالی محفل

۲ر ۲ر ۴ر ۵ر ۳ر

کتب نثر لکچر اقبال ۔ عقد انامل ۔ قاعدہ مرغوب ۔ نماز مکمل ۔ النظر ۔ درود تاج

۲؍ر ۱؍ر ۱ر ۴ر ۶ر ؍ر

26230

شمع محفل

نعتوں کے بے نظیر مجموعہ میں شعرائے سابق و حال کا مقبول اور منتخب کلام جمع کیا گیا ہے۔ دعوٰی ہے کہ اس جیسا ہمہ صفت موصوف مجموعہ کہیں نہ ملیگا۔ کیونکہ ایک ایک شعر اس کا چیدہ اور چوٹی کا شعر ہے۔ بھرتی کا شعر مطلقاً نہیں ہے۔

مجموعہ ہذا میں زبان عربی، فارسی، اردو، پوربی، پنجابی۔ اسی ترتیب کے ساتھ عمدہ عمدہ نعتیں درج کی گئی ہیں۔ صحت کا خیال بدرجۂ کمال رکھا گیا ہے۔ نعت خواں اصحاب دستِ خریداری بڑھائیں اور اس شمع توصیف سے محفلِ تحبیب کو نورانی بنائیں۔ اس پہلے حصے کی قیمت ۵ر ہے

مینجر مرغوب ایجنسی لاہور سے منگائیے